یعنی

اُردو کے محسن اعظم مولانا عبدالحق بی۔اے پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ
و معتمد انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) کی اہم تنقیدات کا مجموعہ
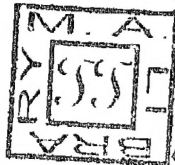
جامع

محمد تراب علی خان۔ بار

مطبوعہ

شمس الاسلام پریس حصہ بازار حیدرآباد دکن
۱۳۵۳ھ
۱۹۳۴ء

فہرست مضامین

باسمہٖ سبحانہٗ تعالیٰ

سنت دیرینہ

مولانا مولوی عبدالحق صاحب کی ہستی علمی دنیا میں وہ لاجواب اور بے مثل ہستی ہے جو تعریف سے بالاتر اور تعارف کی محتاج نہیں۔ مولوی صاحب اردو کے بہت بڑے ادیب اور ان کی تحریریں اردو ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں اردو ادب پر آپ کے جو احسانات ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ آپ ایک زبردست اور بے مثل مقدمہ نگار ہیں۔ چونکہ آپ کے مقاصد تحریر میں تنقید نگاری بھی شامل ہے اس لئے مقدمات کی طرح آپ کی مبصر تنقیدیں بھی اعلیٰ تنقید نگاری کا نمونہ ہیں۔

تنقید ادب کی جان ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ بے راہروی سے بچاتا اور خیال میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ مولوی صاحب کی تنقیدیں وسعت تحقیق کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ آپ جب کسی کتاب پر تنقید لکھتے ہیں تو اس پر پورا عبور حاصل کر کے قلم اٹھاتے ہیں۔ آپ کا یہ خاص کمال ہے کہ جہاں کتاب کی خوبیاں بیان کر کے مصنف کی محنت کی داد دیتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہاں کتاب کے عیوب اور غلطیوں کو دکھانے کے لئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں کہ مصنف کی طرف سے لوگ بدظن نہیں ہوتے۔ بعض اوقات تنقید میں ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں

اس وقت تحریر میں اس قدر دلاویزی آجاتی ہے کہ اصل کتاب سے زیادہ تنقید کے مطالعہ میں مزہ آتا ہے۔

اس مجموعہ میں کل ۲۴ تنقیدیں ہیں۔ رسالہ "اردو" میں جس قدر تنقیدیں مولوی صاحب کے قلم سے نکلیں ہیں ان میں سے اہم تنقیدیں انتخاب کی گئی ہیں۔ اس طرح سے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء تک شائع شدہ اردو کی اہم کتابوں کی تنقیدیں اس کتاب میں آگئی ہیں۔

مولوی صاحب کی تحریریں اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں اور ان کا تحفظ ادب کی معقول خدمت۔ آپ کے مقدمات کا مجموعہ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب تعلقدار علاقہ سرکار عالی نے شائع کیا۔ مضامین کی جمع و ترتیب کی طرف آپ کے ایک لائق شاگرد متوجہ ہیں۔ تنقیدات کی اشاعت میرے حصہ میں آئی ہے۔

تنقیدات شائع کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد جب میں نے اشاعت کی اجازت کیلئے مولوی صاحب سے ذریعہ نیاز نامہ درخواست کی تو مولوی صاحب نے اسی وقت بڑے خلوص اور محبت سے اجازت مرحمت فرمائی۔ جس کے لئے میں موصوف کا تہ دل سے مشکور رہا ہوں۔

میرے جن احباب نے اس مجموعہ کی اشاعت و فراہمی مواد کے سلسلہ میں میری مدد فرمائی ہے ان کا بھی مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً مولوی محمد سردار علی صاحب سابق ایڈیٹر تجلی حیدرآباد دکن کا بیحد ممنون و مشکور ہوں فقط

نیاز مند

محمد تراب علیخان باز

کاشانۂ باز۔ بازار گھانسی حیدرآباد دکن

۱۱۔ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

تنقیدات

دیوان ولی

ولی دکھنی کا دیوان بہت کمیاب ہو گیا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب حیدر ابراہیم سایانی صاحب اسسٹنٹ پرشین لکچرار دکن کالج پونہ نے مرتب کر کے چھپوا دیا ہے۔ طبع کی ضرورت اس لئے داعی ہوئی کہ اس سال بمبئی یونیورسٹی نے ایم اے کے اردو نصاب میں ولی کا کلام بھی داخل کر دیا ہے۔ یہ ضرورت نہ بھی ہوتی تو بھی ولی کا دیوان قابل طبع تھا۔ بہرحال ہم پروفیسر صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ انہوں نے دیباچہ میں صرف ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے جو جناب ابراہیم حاجی یعقوب صاحب نے انہیں عطا فرمایا۔ اگرچہ ولی کا دیوان کمیاب ہے تاہم اس کے قلمی نسخے تلاش سے کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو لازم تھا کہ جس قدر مختلف نسخے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اُن سب کو پیش نظر رکھ کر طبع کے لئے نیا نسخہ ترتیب دیتے۔ تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے گارساں دتاسی کے اُس نسخے کا ذکر نہیں کیا جو اس نے ۱۸۳۳ء (مطابق ۱۲۴۹ ہجری) میں پیرس کے شاہی مطبع میں بڑے اہتمام اور خوبی سے ٹائپ میں چھپوایا تھا۔ دیوان ولی کی ترتیب کے لئے اس کا ہونا نہایت ضروری تھا۔

اب جو ہم دیوان کھولتے ہیں تو پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

رکھتا ہوں ترے نام کو میں ورد زباں کا
کرتا ہوں ترے شکر کو عنوان بیاں کا

علاوہ ذکاسی کے نسخے کے میرے پاس دیوان ولی کے پانچ قلمی نسخے ہیں جن میں سے دو کی کتابت ولی کے زمانہ حیات ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک کا سنہ کتابت ۱۱۴۱ہجری ہے اور دوسری پر کتابت کا سنہ ۱۷ جلوس محمد شاہی لکھا ہے۔ باقی تین میں سے دو نسخے بھی پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی طرز تحریر اور خط سے ظاہر ہے۔ البتہ ایک نسخہ جدید ہے اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۹ہجری ہے اور وہ زیادہ معتبر بھی نہیں ہے۔

ان سب نسخوں میں سوائے ایک کے یہ شعر یوں لکھا ہے۔

کیتا ہوں ترے ناؤ(ن) کوں میں ورد زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

البتہ ایک نسخے میں پہلا مصرعہ اس طرح لکھا ہے۔ "ہر دم ہے ترا نام مجھے ورد زباں کا" ذکاسی نے اپنا دیوان چھ نسخوں سے مرتب کیا تھا۔ اُن سب میں "کیتا ہوں" ہے "رکھتا ہوں" اور "کرتا ہوں" کسی میں نہیں اور نہ یہ اس وقت کی زبان ہے۔ علاوہ اس کے ان سب نسخوں میں کو کا املا کوں ہے اور اس وقت کی تحریر کا یہی طرز تھا جس کی شہادت دوسری قلمی کتابوں سے بھی ملتی ہے۔

دوسرے شعر میں بھی پروفیسر صاحب نے کو ہی لکھا ہے، حالانکہ میرے تمام نسخوں میں
اور دتاسی کے نسخوں میں کوں ہے۔ تیسرا شعر پروفیسر صاحب کے نسخے میں یوں ہے

اس صاد صداقت کی طرف اہل حیا دیکھ
تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا

دتاسی کے نیز میرے تمام نسخوں میں پہلا مصرعہ یوں ہے :-

مجھ صدق طرف [illegible] سوں کے [illegible] دیکھ

اور یہی صحیح بھی ہے۔
چوتھا شعر یہ ہے :-

ہر ذرہ [illegible] میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

اس میں شک نہیں کہ اہل دکن قدیم کتابت میں کاف بیانیہ کو ہمیشہ "کے" لکھتے تھے اور بعد میں جاہل لوگ اسی طرح لکھتے رہے اور اب بھی لکھتے ہیں لیکن میرے اور دتاسی کے تمام نسخوں میں کہ ہی لکھا ہے۔
چھٹا شعر پروفیسر صاحب کے نسخے میں اس طرح ہے :-

جاری ہوئے آنسو میرے دہ سبزہ خط دیکھ
اے خضر قدم سیر کر اس آب رواں کا

دتاسی کے اور میرے تمام نسخوں میں بجائے آنسو کے آنکھو ہے اور

وہ کے بجائے تو ہے جو اُس وقت کی خاص دکھنی بولی تھی۔
ساتواں شعر مقطع کا ہے۔ اس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔
"کہتا ہے۔ ولی دل ستی یہ مصرعِ رنگیں"
یہاں بھی پروفیسر صاحب نے بجائے تو کے یہ لکھ دیا ہے۔
اب دوسری غزل لیجئے۔ مطلع کا پہلا مصرع ہے:۔
وہ صنم جب سے بسا دیدہ حیران میں آ
میرے ہاں تمام نسخوں میں سے کے بجائے سوں ہے۔ اور اس زمانہ کی زبان کے لحاظ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پھر پانچویں اور آٹھویں شعر میں بھی بجائے سوں کے سے چھپا ہے۔ آٹھویں شعر میں یہ بجائے تو ہے مگر میرے اور دناسی کے نسخوں میں یہاں ہے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرع اس طرح
دفتر دزور رہا عشق کے دیوان میں آ
دناسی کے اور میرے نسخوں میں رہا نہیں بلکہ بسا ہے۔ اور بعض نسخوں میں دفتر عشق بھی ہے۔ بارہواں شعر یوں ہے:۔
چشمۂ آبِ بقا جگ میں کیا ہے حاصل
یوسفِ حسن نے اس چاہِ زنخداں میں آ
کسی نسخے میں نے نہیں بلکہ تری ہے۔
مقطع میں سے بجائے سوں اور کو بجائے کوں لکھا گیا ہے۔ اس غزل میں

پروفیسر صاحب کے نسخے میں دو شعر متروک ہو گئے ہیں جو قاسمی کے اور میرے تمام نسخوں میں موجود ہیں وہ یہ ہیں :-

موج بینائی دل اشک میں ہو جلوہ نما   جب سے زلف صنم طرح پریشاں میں آ
جگ کے خوباں کا نمک ہو کے نمک پرورہ   چھپ رہا آ کے ترے لب کے نمکداں میں آ

افسوس ہے کہ ہمیں اتنی فرصت نہیں کہ ہم پورے دیوان پر اس طرح نظر ڈالیں اور نہ اس تبصرے میں اس قدر گنجایش ہے۔ شروع کی دو غزلوں کی کیفیت ہم نے بطور نمونے کے دیدی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس نسخہ سے یہ دیوان مرتب کیا گیا ہے وہ جدید کتابت کا ہے اور اس میں ولی کے زمانے کے املا اور طرز کتابت کا مطلق خیال نہیں رکھا گیا جس سے اس دیوان کی قدر و قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اگر پروفیسر صاحب متعدد نسخے بہم پہنچاتے تو یہ نقص آسانی سے رفع ہو جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض غزلیں درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ اس کے قصائد بعض مخمس اور ترجیع بند بھی اس دیوان میں نہیں ہیں۔

کتابت کی غلطیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو بہت بڑا نقص ہے۔ قدیم کتابت ہونے کی وجہ سے صحت کے متعلق خاص احتیاط کی ضرورت تھی۔

میں انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ولی کے دیوان کا ایک صحیح اور مکمل نسخہ مرتب کرنا چاہتا تھا، لیکن جب میں نے سنا کہ پونہ میں پروفیسر صاحب ایک نسخہ تیار کر رہے ہیں تو میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی اس کی

ضرورت ہے۔

کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ بھی ہے جس میں ولی کے حالات اور شاعری سے سرسری بحث کی گئی ہے اور اسی ضمن میں بعض قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی آگئی ہے۔ مگر اس وقت کی زبان سے کچھ زیادہ بحث نہیں کی۔ بہرحال پروفیسر سایانی صاحب کی سعی قابل شکر ہے کہ انہوں نے ولی کے دیوان کا ایک نسخہ مرتب کر دیا۔ ملنے کا پتہ یہ ہے۔ حیدر ابراہیم سایانی نمبر (۲۱۲۲) سینٹر اسٹریٹ کیمپ پونہ (دکن) قیمت درج نہیں۔
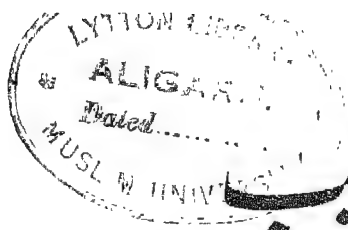
مکاتیب

نواب محسن الملک مرحوم و نواب وقار الملک مرحوم

مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے بڑا کام کیا کہ نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم کے خطوط چھاپ دیئے ان کے حاصل کرنے میں انہیں بہت کچھ کھکھیڑ اٹھانی پڑی ہوگی (خانگی خطوں میں اکثر وہ باتیں مل جاتی ہیں جو دوسری تحریروں یا تقریروں میں نظر نہیں آتیں۔ اُن میں مخاطب جب کوئی دوست یا رازدار ہوتا ہے تو انسان دل کھولکر ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جو عام طور پر لوگوں میں نہیں کرسکتا۔ یا بعض اوقات ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی نسبت یہ گمان ہوتا ہے کہ معاملہ انھیں کی حد تک رہیگا اور اس کا افشا نہ ہوگا۔ اور اِس لئے وہ کبھی کبھی ایسے اسرار بیان کرجاتا ہے اور دل کی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو کبھی وہ زبان پر نہ لاتا اور نہ حوالہ قلم کرتا اور شاید اسی کے ساتھ اُس کے سینہ میں مدفون رہ جاتیں لیکن اُسے کیا خبر کہ رقیب گھات میں لگے ہوئے ہیں جو اس کے ایک ایک پرچے کو ڈھونڈھ نکالیں گے اور اُس کے راز کو ڈنکے کی چوٹ بیان کریں گے۔ خانگی خطوط کی اشاعت اردو ادب میں ایک نئی چیز ہے بہت سے

اول مرزا غالب کے خطوط شائع ہوئے جو اردو زبان کی جان ہیں۔ وہ بہت مقبول ہوئے اور ہمیشہ شوق سے پڑھے جائیں گے۔ اس کے بعد بعض اور اصحاب کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔ مولوی محمد امین صاحب نے یہ خوب کیا کہ ان دونوں بزرگوں کے خط یکجا جمع کر دیئے کیونکہ ان کی زندگی کے حالات اور کام کچھ ایسے ساتھ ساتھ اور ایک ہی قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے دونوں پہلے سرکار انگریزی کے ملازم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے بعد ریاست حیدر آباد میں گئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور دونوں نے بقول نواب محسن الملک بادشاہی نہیں خدائی کی۔ پھر دونوں یکے بعد دیگرے حیدر آباد سے واپس ہوئے تو علی گڑھ پہنچے۔ اور ایک دوسرے کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہوئے اور مرتے دم تک قومی کام میں مصروف رہے۔ ایسے دو ہمعصر شخص مشکل سے ملیں گے جن کے کارنامے بالکل ایک ہی قسم کے ہوں اور پھر اپنی عادت اور خصلت اور اصول میں ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوں۔ یہ خطوط ان دونوں کی سیرتوں کا آئینہ ہیں۔ ایک سیاسی عیاریوں کا بادشاہ ہے تو دوسرا صاف گوئی اور استقلال میں اٹل ہے۔ ایک ہوا کو دیکھتا اور زمانہ کے موافق چلتا ہے تو دوسرے کو اپنے ایمان اور صداقت پر اعتماد ہے۔ ایک اپنی فصاحت سے کام نکالتا ہے تو دوسرا اپنی صاف گوئی سے۔ ایک اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے دل لبھاتا ہے تو دوسرا اپنے منطقی دلائل اور معاملے کی

تہہ تک پہنچ کر قائل کرتا ہے۔ ایک کی خوش بیانی اور ظرافت اور دوسرے کا وقار اور
صبر و سکون دونوں قابل داد ہیں۔ دونوں کے اخلاق اپنے اپنے رنگ میں بے بدل بے عیب
اور بے مثل ہیں۔ مگر ایک گتھی کے سلجھانے میں انجام اور نتیجہ کی پروا نہیں کرتا، اور برے
بھلے ہر قسم کے طریقے کو کام میں لاتا ہے۔ ہر چاہتا ہے کہ جس طرح ہو سکے یہ مصیبت
ٹل جائے پھر خواہ کچھ ہی ہوتا رہے۔ دوسرا اپنے اصول پر نظر رکھتا ہے اور اس سے ایک
انچ نہیں ہٹنا چاہتا خواہ انجام و نتیجہ کچھ ہی ہو۔ ایک معاملات کو دیکھ کر جلد جلد رنگ
بدلتا بگڑتا اور خوش ہوتا ہے۔ دوسرا پہاڑ کی طرح ایک جگہ پر قایم ہے جس پر بیرونی حوادث
کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔ سیرت کا یہ اختلاف ان خطوں میں صاف نظر آتا ہے۔

نواب محسن الملک کے خطوں میں فصاحت اور روانی ہے۔ وقار الملک کے
خطوں میں قوت اور معاملہ فہمی پائی جاتی ہے۔ محسن الملک کے خطوں میں جوانی کی بے چینی
اور تلوّن ہے اور وقار الملک کے خطوں میں بڑھاپے کی دانائی اور دور اندیشی ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ محسن الملک ہمیشہ جوان رہے اور وقار الملک سدا کے بڈھے تھے۔ محسن الملک
جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے اور وقار الملک جذبات پر غالب آنے کی کوشش
کرتے تھے۔ محسن الملک ذرا سی آہٹ سے چونکنے ہو جاتے تھے۔ اور وقار الملک معمولی
افواہوں کو ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔ محسن الملک
معاملہ کا رنگ بدلتا دیکھ کر مضطرب ہو جاتے اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیتے اور
وقار الملک معاملہ کو معاملہ سمجھ کر سکون کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے۔

غرض دونوں کے خط پڑھنے کے قابل ہیں اور جو لوگ اُس زمانہ کے اور خاص کر ریاست حیدرآباد اور علی گڑھ کے حالات سمجھنا چاہتے ہیں وہ ان خطوں کے پڑھنے میں خاص لطف حاصل کریں گے محمد امین صاحب قابل شکریہ ہیں کہ انہوں نے یہ دلچسپ مجموعہ شایع کر دیا کتاب مولوی محمد امین صاحب سے مل سکتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔

سرگزشت الفاظ

اس کتاب کے مولف مولوی احمد الدین صاحب بی اے وکیل لاہور ہیں الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جاندار ہیں وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے عمر بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گزشتہ زمانہ کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنی سے اعلی اور اعلی سے ادنی، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے۔ قابل مولف نے لفظ کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور تحقیق کی داد دی ہے اور ساتھ ساتھ مثالیں دے کر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ موضوع بہت دلچسپ مگر ساتھ ہی بہت مشکل اور محنت طلب ہے اور اسی لئے اس میں کہیں کہیں لغزش یا کوتاہی کا ہو جانا لازم ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میر کی اصلیت کا پتہ لگانا سہل نہیں تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ لفظ پرتگالی ہے۔ پرتگالی زبان میں

اسے اس طرح لکھتے ہیں (Mesa.) ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "اسلامی دنیا میں صلواۃ کا تقدس اور احترام مسلمہ ہے اور ایک مسلمان کی زبان پر اس کی عظمت وشان روز روشن کی طرح عیاں ہے لیکن قوم کی بیکسری خفت عقل اور ضعف ایمان کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس قابل تحریم ومقدس لفظ کو جمع کی صورت میں ایک ذلیل حرکت انسانی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ کہاں صلواۃ اور کہاں صلواتیں" - یہ صحیح ہے لیکن اگر وہ صلواۃ کے لغوی معنوں کی تحقیق کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا اور پھر اردو میں جمع کی صورت میں کن ذلیل معنوں میں استعمال ہونے لگا یہی تو زمانہ کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایک جگہ چھوئی موئی کے متعلق لکھا ہے کہ "چھو تو موئی بدن خشک، پژمردگی طاری اور بس" بدن خشک کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ چھونے سے بدن سکیڑ لیتی ہے۔ مشعلچی کو لکھتے ہیں کہ اردو میں آکر باورچی خانے میں برتن صاف کرنے کی صفت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آئندہ یہی ہو جائے۔ اٹکل کے متعلق لکھا ہے کہ "اگرچہ ابتدا میں قیاس اور رائے قائم کرنا ہی تھا لیکن قیاس اور رائے کی وقعت اٹکل پچو کی ترکیب میں ظاہر ہوتی معلوم ہوتی ہے اٹکل اب بھی قیاس اور اندازے ہی کے معنوں میں مستعمل ہے ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "مدرسہ تعلیم گاہ اور مکتب سے یقیناً اعلیٰ رتبہ کی چیز ہے" ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مدرسہ تعلیم گاہ سے ہر حالت میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔

"جلاپا، انگریزی میں جلاپ، میکسیکو کے ایک شہر جلاپا کے نام سے ہے"

قابل مؤلف نے یہ نئی بات لکھی ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرّب ہے۔ کراہت سے بچنے کے لئے مسہل کے لئے استعمال ہونے لگا ہے" رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہے" جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل رزائی سے ہے چونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لئے یہ نام پڑ گیا۔

پاکھنڈ کے لغوی معنی مؤلف نے وید کے برخلاف بدعت بیان کئے ہیں اور اصطلاحی معنی، وہ عبارت جو دکھاوے کی ہو۔ حرامزدگی، بدذاتی، شرارت لیکن لفظ کی تحقیق سے گریز کیا ہے۔ پاکھنڈ مرکب ہے پا اور کھنڈ سے۔ پا کے معنی پالنے والے یا حفاظت کرنے والے کے ہیں جس سے مراد دھرم لی جاتی ہے۔ کھنڈ کے معنی منتشر کرنے اور توڑنے کے ہیں۔

بعض الفاظ پردہ پوش ہوتے ہیں یعنی کسی مکروہ یا ناگوار شے یا خیال کو اچھے اور خوشنما الفاظ میں ادا کرتے ہیں مؤلف نے متوالا کے لفظ کو بھی انہیں میں شمار کیا ہے۔ وہ اسے مت (سمجھ، عقل) اور والا سے مرکب سمجھے ہیں حالانکہ یہ لفظ مد اور والا سے مرکب ہے۔ مد کے معنی ہندی اور سنسکرت میں عرق، شراب اور مستی کے ہیں۔ کثرت استعمال سے "د" "ت" سے بدل گئی ہے۔ ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔

اسامی کے ایک معنی امیر کے بھی لکھے ہیں۔ درحقیقت یہ امیر کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ بعض اوقات مالدار سے مراد ہوتی ہے مگر اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے۔

مؤلف نے مخنثوں اور ہیجڑوں کے مستعمل الفاظ کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے جو

کتابی خزانوں میں بند اور بیکار پڑے ہیں اور جن سے ہم ناواقفیت یا کم فہمی کی وجہ سے کام نہیں لیتے ہیں اس خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ درحقیقت ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا یا جو ٹکسالی نہیں سمجھے جاتے۔ حالانکہ وہ بعض خیالات کے ادا کرنے میں بہت کام آسکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قابل مؤلف نے اس بحث کو مختصر طور سے چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔ یہ چنداں قابل شکایت نہیں کیونکہ اس مختصر کتاب میں ہر بحث تفصیل سے بیان نہیں ہو سکتی تھی لیکن شکایت اس کی ہے کہ انہوں نے مثال کے طور پر ایک لفظ بھی تو ایسا نہیں لکھا جو اُن کی رائے میں رواج دینے کے قابل ہے اگر وہ چند مثالیں بھی لکھ دیتے تو ناظرین کو مؤلف کے مطلب کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی۔

بہرحال یہ ایسی باتیں ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے الفاظ کی تحقیق میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی۔ قابل مؤلف نے انگریزی زبان کی مشہور کتاب ریورنڈ ٹرینچ کی تالیف (   ) کو پیش نظر رکھا ہے بلکہ اس کا چربہ اُتارا ہے۔ ترتیب بھی وہی ہے اور انداز بیان بھی قریب قریب اسی طرح کا ہے البتہ جہاں اصل کتاب میں انگریزی، فرانسیسی، لاطینی لفظ تھے، مولف نے ان کی جگہ سلیقہ سے اردو، ہندی، فارسی، عربی الفاظ داخل کر دئے ہیں انداز بیان میں کسی قدر مولانا آزاد مرحوم کا بھی تتبع کیا ہے اور کہیں کہیں ان کی تصانیف سے بھی مدد لی ہے اور یہ کتاب بھی مرحوم ہی کے نام سے معنون کی ہے

لائق مؤلف کی محنت قابل داد ہے ۔ یہ کتاب طلبہ اور عام شائقین کے لئے بہت کارآمد ہے اس سے اُن کے دلوں میں الفاظ کی تحقیق، لغوی، معروف اور اصطلاحی معنوں کے فرق، حالات زمانہ کے اثر سے معنوں میں تغیر و تبدل اور لفظوں کی اصل دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہ ادب کی تحصیل میں بہت کچھ مدد دیتا ہے ۔

خوشی کی بات ہے کہ پنجاب گورنمنٹ نے ازراہِ قدردانی مؤلف کو انعام عطا فرمایا ہے اور وہ اس کے مستحق تھے ۔

مولوی احمد دین صاحب بی اے وکیل لاہور سے مل سکتی ہے چھوٹی تقطیع ۔ تعداد صفحات (۳۰۴) قیمت دو روپے چھپائی بھی اچھی ہے ۔

شرح دیوان غالب

غالب کا کلام ایک لازوال نعمت ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرجاتا ہے اس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کے زندہ رہنے میں کلام نہیں۔ اگرچہ بلکہ اگر یہ نہ بھی رہے تو بھی یہ کلام زندہ رہے گا کیونکہ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ان قیود سے بالا و برتر ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ سینکڑوں لکھی جائیں گی اور فاضل شارح اس کلام کے سائے میں اپنی جدت اور ذہانت کے موقع ڈھونڈیں گے اور بقائے نام کا ذریعہ سمجھیں گے۔ حال میں مکمل شرح کے نام سے ایک شرح دیوان غالب کی شائع ہوئی ہے۔ اس کے مؤلف مولوی عبدالباری صاحب آسی الدنی سکریٹری انجمن خاصان ادب لکھنؤ ہیں۔ یہ ایک بڑی ضخیم کتاب ہے۔ مؤلف نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ معانی و مطالب کے بیان کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اکثر دوسرے اساتذہ کے اور کہیں کہیں اپنے بھی اشعار نظیر میں پیش کیے ہیں اگرچہ بعض مقامات پر یہ بے جوڑ اور بے محل معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے شارحوں کے کا بھی وقتاً فوقتاً موقع اصلاح کرتے جاتے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے بعض اشعار

اب بھرانش (بگڑی ہوئی بولی) ہے اور یہی شمالی ہند کی جدید زبانوں یعنی ہندی پنجابی مرہٹی وغیرہ کی اصل ہیں۔

اب ہندی کی کئی شاخیں ہیں راجستانی پچھمی ہندی پوربی اور بہاری۔ بلحاظ اصل کے پچھمی مغربی ہندی کا تعلق پنجابی سے بہت گہرا ہے اور وہ ہندی جو آج کل ادب و انشا میں کام آتی ہے اور اردو دونوں پچھمی یعنی مغربی ہندی کی شاخ سے نکلی ہیں اس لئے اردو کا تعلق پنجابی سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن محض الفاظ کی مماثلت سے یا ہندی مشترکہ الفاظ پیش کر کے یہ استدلال کرنا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے درست نہیں ہے۔ ورنہ اس دلیل پر تو مرہٹے اور گجراتی بھی یہ کہنے کو تیار ہو جائیں گے کہ اردو ہماری زبان سے نکلی ہے۔

مؤلف تذکرہ اردو مصنفوں اور مورخوں سے سخت ناراض ہیں کہ انہوں نے اس امر پر مطلق توجہ نہیں کی کہ اردو پنجابی الاصل زبان ہے اور اردو زبان کی تاریخ لکھتے وقت پنجابی کی اہمیت اور گہرے تعلق کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ مورد الزام ان کی نظروں میں بیچارے مولوی محمد حسین آزاد مرحوم ہیں کہ وہ اتنی مدت پنجاب میں رہے اور پھر بھی اس حقیقت سے ناآشنا رہے۔ سچ ہے "این سعادت بزور بازو نیست"۔
لیکن آزاد مرحوم یا دوسرے مصنفین کو تعصب یا طرفداری کا الزام دینا کس قدر ناانصافی ہے۔ آزاد مرحوم نے اپنی کتاب آبحیات اس وقت لکھی جب کہ ہماری زبان میں ایسی باتوں کا چرچا تک نہ تھا اور بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس وقت تک تحقیق بھی نہ ہوئی تھیں۔

مرحوم نے باوجود اس کے کہ انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں سے واقف نہ تھے جو کچھ کیا وہ بہت قابل قدر ہے۔ یہاں تک کہ خود مؤلف تذکرہ اُن کے قدم بہ قدم چلنے پر فخر کرتے ہیں۔

بعض باتیں اس تذکرہ میں قابل مؤلف نے ایسی لکھی ہیں جو اسی دیار کے لوگ لکھ سکتے ہیں اور جن پر جدّت کا لفظ صحیح معنوں میں صادق آتا ہے۔ مثلاً وہ اس امر کے ثبوت میں کہ اردو نے پنجاب ہی میں جنم لیا ہے ایک زبردست دلیل پیش کرتے ہیں جو میں انہیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں حقیقت میں قابل غور اور لائق مطالعہ ہے فرماتے ہیں :-

"اس کے علاوہ ایک سائنسی دلیل صوبۂ پنجاب کے مردم خیز ہونے کی یہ ہے کہ انسان کی بہترین غذا گیہوں ہے جو ہمارے دماغ کو بیحد تقویت پہنچاتی ہے اور وہ اہل پنجاب کے روزمرہ استعمال کی چیز ہے غرض کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خاص مشرقی زبان جیسے کہ اردو ہے اس ملک میں پیدا نہ ہوئی ہو۔ ہاں بیشک ہوئی ہے!!!"

اللہ رے زور !!!

اب فرمائیے ایسے ظالم کا کیا کرے کوئی ؟ غرض شروع کے کوئی بتیس صفحے انہوں نے اسی بحث کے نذر کردئے ہیں جس کا عنوان تاریخ زبان اردو ہے اس کے بعد چند ورق شعر و شاعری کی حقیقت پر تحریر فرمائے ہیں اس میں انہوں نے چند شعر لکھے ہیں اور اُن کی خوبیاں بتائی ہیں۔ یہ تقریباً سب کے سب مولانا حالی کے

مقدمے سے نقل کئے گئے ہیں مثلاً پہلا شعر ہے ۔

وقت پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اس کے متعلق فرماتے ہیں "دیکھو اس شعر میں ایک قسم کی روانی یعنی وزن شعر بھی پایا جاتا ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو شعر شعر نہیں بلکہ نثر ہو جائے" تخیل کے متعلق ایک انوکھا خیال ظاہر فرمایا ہے کہتے ہیں کہ "زبان انگریزی میں خیال کو ایمیجنیشن کہتے ہیں اس کے متعلق مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں بڑی بڑی تخئین پیش کی ہیں کہ خیال کس طرح شعر پر اپنا اثر کرتا ہے ۔ مگر میری دانست میں خیالات صرف ہمارے محسوسات ہی کی توسیع کا دوسرا نام ہے اور ہماری تمام ذہنی کیفیات کی بنا حقیقت میں انہی حواس خمسہ پر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس جو بات ہمارے حواس ہی سے خارج ہو مثلاً دیوؤں پریوں وغیرہ کا وجود تو جو شاعری ان باتوں پر قائم کی جائے گی وہ بھی اصلیت سے بالکل دور ہوگی ۔ گویا کسی شعر کی اصلیت کی تصدیق ہمارے حواس خمسہ ہی سے ہونی چاہیئے" جب شاعری کا دائرہ اس قدر محدود اور تنگ کر دیا جائے تو پھر آدمی بجائے شاعری کے بڑھئی کا کام کیوں نہ کرے جس کی تصدیق ہر وقت حواس خمسہ سے ہوتی رہتی ہے ۔

موضوع شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اب شعر کا مدعا اور شعر گوئی کا موضوع وہ نہیں رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلحاظ موضوع شاعری ان میں تعلقات سے اپنا قدم کبھی باہر نہیں رکھ سکتی ۔ الوہیت ، حکومت اور حسن صورت ۔ "حسن صورت سے

مطلب صرف مرد عورت کا حسن ہی مراد نہیں بلکہ "پہاڑ، دریا، جزیرے، آبشار، باغ نہریں، پھول اور مختلف قسم کے مناظر فطرت ہیں۔" "لہذا حسن و عشق کے بجائے ہمارے شعراء کو آئندہ مناظر قدرت اور جذبات فطرت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے" شاعری کی تعریف طرح طرح سے کی گئی ہے۔ کسی نے قوت خیال پر شعر کی بنیاد رکھی ہے۔ کسی نے الفاظ کے حسن پر کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ کہا ہے۔ مگر مؤلف تذکرہ کے خیال میں "یہ سب فن شعر کے اصول مفروضہ یا تصوریاں ہیں۔ پریکٹیکلی یعنی عملاً شعر گوئی کے لئے صرف سجیشن (Suggestion) کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ ایک انگریزی لغت ہے جس کے معنی مشورے یا ایک بات سے دوسری بات کا احساس ہونا ہے" اس کے بعد فرماتے ہیں کہ قدما کے لئے حسن و عشق کا ایک ایسا واحد جامع مضمون تھا کہ اُن کو شعر گوئی اور سخنوری کے لئے کسی اور مضمون کے تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی حالانکہ ہمارے ہاں معاملہ برعکس ہے۔ اب شعر و شاعری میں سب سے زیادہ وقت طلب امر انتخاب مضمون ہے" آگے چل کر انہوں نے سب سے بڑی اور خاص چیز شاعری کے لئے استفادہ کو قرار دیا ہے۔ جس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ پہلے آبحیات لکھی گئی۔ اس کے بعد اسی مضمون کو زیادہ تحقیق کے ساتھ حالی نے لکھا اور اس سے "مستفاد" ہو کر شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں حسن شعر کے متعلق بہت سے نکتے لکھے۔ یا سودی کی نظم سے اکبر نے "مستفاد" ہو کر ایک نظم روانی دریا کے عنوان سے لکھی اور جب یہ نظم شہباز کی

نظر سے گزری تو انھوں نے "مستفاد" ہو کر آب رواں کے عنوان سے ایک نظم تصنیف کی۔

بعض بعض رائیں عجب ہیں۔ کہتے ہیں کہ مبتدی شعرا یا دوسرے درجہ کے شاعر مصنفین کے لئے یہ ایک وسیع میدان ہے کہ وہ نظم الصبیان کی تصنیف میں طبع آزمائی کریں" حالانکہ بچوں کی نظمیں لکھنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے شاعر کی ضرورت ہے مبتدی سے اس کی توقع کرنا عبث ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مؤلف شعر کی حقیقت سے کہاں تک واقف ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "حیات جاوید میں سرسید کی بیوگریفی ایسی مکمل و مستند لکھی ہے کہ اگر اسی میں سرسید کے وہ خطوط جو بعد کو چھپے درج ہوتے تو اردو میں انگریزی کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا نمونہ بنتی" محض ان خطوط کے درج کر دینے سے کیا عجب بات ہے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مولانا حالی نے دو مرثیے بھی لکھے ہیں۔ مرثیۂ غالب اور مرثیۂ حکیم محمود خاں، یہ دونوں ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان کے ساتھ چودھری خوشی محمد ناظر کا مرثیۂ سرسید احمد خان بھی ملا لو تو پھر ان نظموں مرثیوں سے "مستفاد" ہو کر اردو میں بہتر سے بہتر دردناک مرثیہ تصنیف کرنا چنداں مشکل نہیں رہتا" اس خیال کا مؤلف نے کئی جگہ اعادہ کیا ہے چنانچہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ جو نمونہ مجموعہ کلام شبلی نے پیش کیا ہے اگر اسی قسم کی متعدد کتابیں اردو میں اور تصنیف کی جائیں تو پھر ہمیں بوستاں، سکندر نامہ، اور شاہنامہ جیسی کتابیں تصنیف کرنے میں کچھ دقت واقع نہ ہو۔ کیونکہ بوستاں اصل میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہی ہیں

جو حکیم لقمان، شاہ پور یا حجاج بن یوسف وغیرہ ایسے مختلف شخصوں کی منظوم سیرتوں سے لبریز ہیں۔ اسی طرح سکندر نامہ محض سکندر اعظم کی تاریخی داستان کو پھیلا کر لکھ دیا گیا ہے یا شاہنامہ میں رستم کے حالات و واقعات ہی نظم کئے گئے ہیں" کیا سہل لکھا ہے یا گیا ہے اور ساتھ ہی چند الفاظ میں جو بوستاں سکندر نامے اور شاہنامے پر لاجواب تنقید فرمائی ہے اس سے قابل مولف کا ذوق سلیم ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے ہی صفحہ پر پھر یہ ارشاد ہوا ہے کہ "اگر ہمارے غزل گو شعرا قافیہ پیمائی کو آیندہ ترک کر دیں اور اسی طرح ادبی رسائل کے شاعر نامہ نگار بھی کچھ تھوڑی سی مدت توجہ دے کر اپنے ملک یا قوم کی تمام اعلی سیرتوں اور کیریکٹروں کو نظم کر ڈالیں تو اسی ادنی ابتدا سے پھر ہمارے ہاں اردو میں بھی راماین، مہابھارت، ہومر کا الیڈ اور فردوسی کا شاہنامہ وغیرہ ایسی ضخیم کتابیں نظم میں موجود ہو جائیں" گویا راماین، مہابھارت، اور الیڈ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ منظوم ہیں اور ضخیم ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے غزل گو شعرا اور رسالوں کے شاعر نامہ نگار ضرور اس قابل قدر مشورے پر عمل کریں گے۔

مولانا شبلی کے کلام پر جو تنقید فرمائی گئی ہے وہ بھی خاص توجہ اور قدر کے لائق ہے امید ہے کہ اردو کلام کے نقاد اس سے ضرور "مستفاد" ہوں گے فرماتے ہیں کہ "وہ دراصل ایک جبلی شاعر نہ تھے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مگر ایک طرف اسلامی تاریخ اور مشاہیر اسلام کی سیرتوں کا مطالعہ اور دوسری طرف شعر فہمی اور ہر قسم کے اردو فارسی نظموں کے حسن و قبح کی تحقیق کے جذبے نے جو بعد کو موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں اپنا

رنگ دکھانے لگا، انہی دو اتفاقی باتوں نے مولانا کو شاعری کے دائرہ میں لا ڈالا"۔
آگے چل کر لکھتے ہیں "آپ کے عام حالات زندگی اور طریق بود و ماند سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آپ ہرگز شاعر بننا نہیں چاہتے تھے یا اس طرف ان کی دلی توجہ مطلق نہ تھی با ایں ہمہ جو نظمیں مولانا شبلی نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں وہ ان شعرا کے لئے جو قومی روایات یا بعض ملکی مسائل سادہ طور پر نظم کرنا چاہیں ایک اچھا نمونہ ہیں۔ ایک دوسری جگہ ان کے اردو کلام کی داد ان الفاظ میں دی ہے "اردو میں ان کا ایک مجموعۂ کلام اور اپنے بڑے بھائی کا ایک دردناک مرثیہ ہے جن کو مولانا نے اپنا خاص رجحان طبیعت اور اپنی قوت نظم اچھی طرح دیکھ بھال کر لکھا ہے ایک دوسرے مقام پر مولانا کے متعلق فرمایا ہے کہ "مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں جمہور شعرا کے خلاف دبیر کو ایک مبتذل شاعر ثابت کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہے معلوم نہیں یہ رائے انہوں نے کہاں سے قائم کر لی۔

امیر خسرو کا اردو کیا ہندی کلام بھی باوجود تلاش کے اب تک دستیاب نہیں ہوا اور جو پہیلیاں وغیرہ اُن سے منسوب کی جاتی ہیں اُن کے متعلق بھی صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کونسی ان کی ہے اور کونسی الحاقی ہیں مگر قابل مؤلف نے اس مشکل کو کس خوبی سے حل فرمایا ہے۔ کہتے ہیں کہ "زمانے نے خسرو کا وہ اردو کلام جو عوام کی عقل و فہم سے کچھ بالا تھا، بالکل معدوم کر دیا" مؤلف کی تحریر سے امیر خسرو کی نسبت ایک اور نئی بات معلوم ہوتی ہے "امیر خسرو کے عہد سے پہلے زبان اردو کبھی محل ایک

سے آگے نہیں بڑھی لہٰذا اس نے جو کام کیا وہ کرنیل گلکرسٹ (جس کو حکومت نے
ں اسسٹنٹ اور ممد و معاون بھی دے رکھے تھے) کی ادبی کارگزاریوں سے
ہخت مشکل تھا مثلاً اس کو ادنیٰ ادنیٰ ڈھکوسلوں اور انملوں سے لے کر اس وقت
اظ سے بہت اعلیٰ درجہ کی غزلوں تک خود تصنیف کرنی پڑیں تاکہ یہ زبان علمی
ت سے ملک میں رائج ہو جاوے۔" کاش وہ اپنے انتخاب میں اردو کی ان اعلیٰ
غزلوں میں سے ایک آدھ ہی نقل فرما دیتے۔ ایک دوسری بات جو تاریخی
سے خاص وقعت رکھتی ہے یہ تحریر فرمائی ہے کہ "قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے
اور تغلقوں کے زمانۂ حکومت میں امیر خسرو کو سرکاری طور پر اس زبان کی ترویج
ے بعض درسی کتابیں مثلاً خالق باری وغیرہ تالیف کرنے کا حکم ہوا اور اس نے
اب کے علاوہ غزلیں گیت، دوہرے، انمل دوسخنے اور پہیلیاں وغیرہ بھی
سی غرض سے تصنیف کی تھیں۔" فاضل مؤلف نے خلجی اور تغلق بادشاہوں
پنجاب کا کرنل ہالرائڈ سمجھا ہے۔
عر اور شاعری کے متعلق آپ کی کچھ رائیں درج ہو چکی ہیں لیکن نمونے کے طور پر
ں اور درج کی جاتی ہیں ناسخ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "شاعری حقیقت میں قافیہ
ں ہے بلکہ استعارہ و تشبیہ وغیرہ کے زور سے ایک معمولی سی بات کو لطیف
گوار بنا دینا ہے اور یہ بات ناسخ کے کلام میں ہر جگہ واضح پائی جاتی ہے۔"
دسری رائے ملاحظہ فرمائیے "مولانا حالی، مجروح اور سالک دہلوی نے جو

مرثیے (مرزا غالب کے) لکھے ہیں۔ وہ تینوں بے نظیر اور بے مثل ہیں اور مرزا غالب کی دلی تمنا کو پورا کرتے ہیں" حالانکہ مجروح وسالک کے مرثیوں کو مولانا حالی کے مرثیہ سے کیا نسبت ہے۔ مؤلف کا ذوقِ سخن عجیب قسم کا ہے وہ ہر شاعر کو جو غزل کے علاوہ کسی مضمون پر تک بندی کر سکتا ہے اعلیٰ درجے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ جہاں انہوں نے اُن شعرا کے نام گنوائے ہیں جن کا کلام ہر ادنیٰ اور اعلیٰ شاعر کے لئے رہنمائی کا کام دیتا ہے وہاں انہوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ اُن سب شاعروں کے نام بلا تکلف لکھ دیئے ہیں جو غزل کے علاوہ دوسرے مضامین بھی نظم کر سکتے ہیں۔ ان کو وہ "نیچرل گو" شعرا کا خطاب عطا فرماتے ہیں۔

مؤلف نے بار بار شعرا کو یہ ہدایت کی ہے کہ انہیں گرد و پیش کے حالات و واقعات سے "مستفاد" ہو کر قومی، تاریخی اور نیچرل مضامین پر نظمیں لکھنی چاہئیں اور تاریخی واقعات و روایات کو نظم کرنا چاہئیے۔ لیکن انہوں نے ایک عالم بے عمل کی طرح محض زبانی نصیحت ہی نہیں کی بلکہ شعرائے زمانہ حال پر رحم کھا کر یا ذوقِ سخن سے بے تاب ہو کر نمونے کے طور پر اپنا ایک قطعہ بھی پیش کیا ہے جسے حضرت سرخوش (مؤلف تذکرہ) کا خلاصۂ کلام کہنا چاہئیے۔ میں باوجود اس طوالت کے اس کی نقل کرنے پر مجبور ہوں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام مجھے معاف فرمائیں گے اور کچھ تعجب نہیں کہ پڑھنے کے بعد وہ اس قدر محظوظ ہوں کہ میرا شکریہ ادا کریں۔ قطعہ یہ ہے۔

شاہ و گدا

یک مرض میں ہوا شہِ اسپین — سب یہ کہتے تھے کہ اب جینا ہوا اس کا محال

ل معدے میں سینے پہ خلش تھی پیہم — دل گھٹا جاتا تھا خفگی کہ بڑھی اس کی طحال

جمع ہوئے سب شہر کے بلوائے حکیم — سب نے دکھلائے جو اس فن میں وہ رکھتے تھے کمال

جب کہ طبیبوں کی دواؤں کا اثر — جوتشی آئے وہاں آئے نجومی، رمّال

ے شاہ کی کتنی ابھی دیکھو باقی — اہلِ تنجیم سے دربار نے پوچھا یہ سوال

ں ہو کے کہا سب نے نہیں شاہ کو مرض — نہ کوئی عارضہ ہم دیکھ چکے اس کی فال

ہے کوئی سینے پہ چڑھا اس کے مگر — ہو گئی جس سے بہت اس کی طبیعت بھی نڈھال

ربار نے پھر پوچھا کہ کیا اس کا علاج — دیوِ غم کس طرح ہو سینے کا اس کے پامال

ل کر کہا اس درد کا ہے چارہ اک — سب کتابوں میں لکھا اپنی یہی ہے احوال

شاہ کے اس شخص کا لے آؤ قمیص — نہ ہو جس کو کبھی درد و غم و رنج و ملال

ش اس کی تو اک پایا فقیر آزاد — غم و غصہ کا تھا دل کو کبھی جس کے نہ خیال

عا تن پہ قمیص اس کے نہ کرتہ کوئی — خوش تھا وہ ننگا منگا یونہی رہتا تھا نہال

الغرض صدمے ہیں شاہوں کو بھی درپیش یہاں
مال و دولت سے نہیں جاتا کبھی دل کا وبال

یہ بھی خیال رہے کہ مولانا حالی کے بعض قطعات کے ساتھ اسے درج کیا گیا ہے

اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ اگر حضرت سرخوش اپنے کلام کا مجموعہ شائع فرمادیں تو یہ تبع
کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گا۔ اگر شاعری یہی ہے تو وائے بر شاعری۔ اس تذکرہ
کا "جزو ثالث" "انتخاب کلام مشاہیر شعرائے اُردو قدیم مع تذکرہ و تبصرہ موسوم بہ
سرخوش" ہے جو کل کتاب کے دو تہائی حصے سے بھی زیادہ ہے۔ اُن کی مختلف ابو
اور اُن کے قطعہ سے اُن کے ذوقِ سخن کا ایک حد تک اندازہ ہو چکا ہے۔ انتخاب
کلام سے اس میں اور مدد ملے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ غزل کو اس قدر حقیر
سمجھتے ہیں کہ اسے قابلِ انتخاب خیال نہیں کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "غرض جذبات
فطرت، نیچرل و قومی اشعار اور عام اخلاقی و ملکی نظمیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ ادب اُردو میں
دستیاب ہوسکتی ہیں وہ سب اس بیاض میں جمع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی مفید نظمو
کا ایک وسیع انتخاب علی گڑھ سے بھی شائع ہو چکا ہے مگر اس میں بعض بعض عامیانہ
خیال کی نظموں کو بھی کتاب کا حجم بڑھانے کے لئے جگہ دی گئی ہے۔ حالانکہ موجودہ
(یعنی مؤلف کے اڈیٹر) انتخاب میں ہر ایک شاعر کی صرف دو ایک ایسی نظمیں منتخب
ہو کر درج ہونگی کہ اُن سے بہتر اس شاعر کے دیوان یا مجموعۂ تصنیف میں یا اس کے
قلم سے کبھی نکلی ہی نہوں" اب اس انتخاب کی خود ہی مثال دے کر تشریح بھی فرمادی
ہے جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔ ملاحظہ ہو "مثلاً ذوق اور غالب کی اچھی سی اچھی غزلیں
عام تذکروں میں قلمبند کی گئی ہیں مگر میری ذاتی رائے ہے کہ اگرچہ غزل میں ذوق اور غالب
کے برابر یا اُن کے کچھ قریب قریب حال کے شعرا نے بھی غزلیں کہہ ڈالی لیکن جو سہرا پہلے

الب نے کہا اور پھر اس کی تقلید ذوق نے کی باوجودیکہ صدہا شعرا نے اس بارے
ہت سعی و کوشش بھی کی ہے مگر ویسے سہرے پھر کبھی تصنیف نہیں ہوئے۔ لہذا اس
ایں صرف ایسے ہی نادر الوجود مگر مفید اشعار انتخاب ہو کر درج کئے جائیں گے
ے یہ سہرے" اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی اور حقیقت یہ ہے
ل مؤلف نے اس قول پر پورا عمل کیا ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد کے کلام میں سے
تین اُردو اور چار فارسی رباعیاں انتخاب فرمائی ہیں۔ میر تقی میر کی صرف
ثنوی "جھوٹ کی مذمت" انتخاب کی گئی ہے جو میر صاحب کے ادنیٰ کلام میں سے
انشا کے ہاں سے مثنوی "در ہجو زنبور" مثنوی در ہجو کھٹمل، مچھروں کی شکایت
رمائی گئی ہے۔ ناسخ کے کلام میں سے ایک غزل لکھنؤ کی تعریف میں درج کی گئی ہے
س خیال سے کہ مسلسل ہے اور عشقیہ نہیں۔ البتہ آتش پر خاص عنایت ہے کہ
غزلوں میں سے مختلف اشعار انتخاب فرمائے گئے ہیں۔ غالب کے کلام میں سے
سہرے کے چکنی ڈلی کی تعریف بھی درج کی گئی ہے۔ محض اس خیال سے کہ ایک
مضمون پر مسلسل غزل ہے کیا نظر انتخاب ہے اور اس کے بعد اُن کا منظوم خط
ں نے نواب علاء الدین خان مرحوم کو بطور تفنن کے لکھا تھا، اور اس کا منظوم
بھی منتخب فرمایا گیا ہے۔ ایسے انتخاب پر بے اختیار لاحول بھیجنے کو جی چاہتا ہے
کے ہاں سے کچھ انتخاب نہیں کیا گیا۔ اکبر کے وہ بہت مداح ہیں اور اس مدح کی
نی دریا کی نظم منتخب فرمائی ہے اور ایک مشہور قطعہ جو پردہ پر ہے اس سے

ناظرین اُن کے ذوقِ سخن اور انتخاب کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ قابل مؤلف کا فہم عالی مرزا غالب کے کلام کی خوبیوں کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ ان کی شوخی ظرافت آزاد روی اور تخیل کی بلند پروازی کو کسی اور ہی بات پر محمول کرتے ہیں اور اُن کی سیرت پر انہوں نے ایسے رکیک اور عامیانہ حملے کئے ہیں کہ جیسے کوئی کسی بازاری معمولی آدمی پر کرتا ہے جن کے ذکر سے ہم اپنا قلم آلودہ کرنا نہیں چاہتے۔

تذکرے میں کہیں کہیں تاریخی غلطیاں بھی ہوگئی ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی کے انتقال کی نسبت لکھا ہے کہ "مولانا شبلی نے یورپ، مصر اور شام وغیرہ کا بھی سفر کیا تھا مگر کشمیر میں سیر کرنے کو گئے تھے کہ بخار چڑھا اور وہاں ۵ اگست ۱۹۱۴ء کو رحلت پاگئے"۔ یہ سراسر غلط ہے۔ بیدل کو دہلوی لکھا ہے حالانکہ وہ پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ چہار درویش اور باغ و بہار دو جدا کتابیں سمجھ لی گئی ہیں۔ یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔

غرض کہاں تک لکھوں کتاب کیا ہے ایک سمندر ہے۔ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اس میں شک نہیں کہ قابل مولف کی نظر بہت وسیع ہے، اردو زبان، اس کی تاریخ اور ادب، شاعری، لغت، صرف و نحو، معانی و بیان وغیرہ پر جس قدر کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں کوئی اُن سے نہیں بچی۔ قدیم و جدید شعرا کا تمام کلام اُن کی نظر سے گزر چکا ہے۔ چشم بد دور خود بھی شاعر ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ذوقِ سلیم

رڑھنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں اعلیٰ سے
ے کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مضحکہ خیز خیالات اس طرح ملا کر رکھ دئے ہیں کہ
گراں گزرتا ہے۔ اور کتاب کے طرز تحریر نے اُسے اور ناگوار اور گراں کر دیا
ندا میں مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ کتاب "سلسلۂ ستم ظریف" میں کیوں داخل
لیکن کتاب ختم کرنے کے بعد ثابت ہوا کہ بے شک وہ اسی سلسلے کے لائق
ت یہ ہے کہ قابل مؤلف سے بڑھ کر کوئی ستم ظریف نہیں ہو سکتا۔
مؤلف نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے "امید ہے کہ میری یہ ناچیز کوششیں
یں جائیں گی۔ اور اس تذکرہ کی بعض جدت طرازیوں کی محض وسعتِ ادب
ے ضرور قدر کی جائے گی۔" ہم اس دعا اور آرزو میں اُن کے ساتھ شریک
اتھ ہی ناظرین کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ اس کا دوسرا حصہ بھی عنقریب
نے والا ہے۔

تلخیص عروض و قافیہ

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اب تک عروض و قافیہ پر جو کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ اُن میں کوئی جدت نہیں۔ اپنے خشک مضامین اور اُلجھی بحثوں سے ناقابل اعتنا ہیں۔ وہی تصرف و زحافات کی پیچیدہ راہیں۔ وہی اصطلاحات کی طولانی اور غیر مختتم داستان بے مزہ۔ غرض جو تھوڑا بہت فائدہ اور غایت اس فن شریف کی بتائی جاتی ہے وہ بالکل مفقود تھی۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ دشوار تر اور فضول ہو گیا تھا۔ مزاحف بحریں اور ان کے اصطلاحی عجیب و غریب نام اور بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کو ترک کرنا اولیٰ تھا۔ جو ایک زمانے سے تقلیداً جز و فن بنی ہوئی تھیں۔ ضرورت تھی کہ ان امور کو ملحوظ رکھ کر کوئی ایسا رسالہ لکھا جاتا جو مختصر اور مفید و آسان ہوتا۔ اس ضرورت کو ملک کے نامور اور فاضل اہل قلم مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نے "تلخیص عروض و قافیہ" کے نام سے ایک رسالہ شائع کر کے ایک حد تک پورا کر دیا۔ یہ رسالہ عروض کی تقریباً تمام ضروریات پر حاوی ہے اور نسبتہً اس کا بیان بہت سلجھا ہوا۔ زبان سادہ اور عبارت سلیس ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ "شعر اردو میں اوزان عرب کا متبع ہوتا ہے۔" لیکن

بیز ہے جس نے اردو شعر کی شیرینی اور لطافت کو کم کر دیا ہے۔ حالانکہ بقول مولانا
حد تک (ٹھیک تھا) جہاں تک ہم کو طبع موزوں اجازت دیتی ہے۔" مگر اردو کے
ہ یہ رسالہ عربی عروض کا رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ اور مولانا نہیں چاہتے کہ
عروض کی تقلید سے قدم باہر نکالا جائے مگر ہم کو اپنی زبان کے فطری ساخت کے
سے آزادانہ اور ایک حد تک جدید اصول پر اس فن کو مرتب کرنا چاہیئے۔ اور
فضول ولایعنی تقلید کا جامہ اتار پھینکنا چاہیئے جو یقیناً مضر ہے۔
مولانا نے ۷۳ صفحات میں پورا فن عروض سمجھا دیا ہے۔ اور بعض بعض
ے خوب اور جدید بھی لکھے ہیں۔ مسائل کو عام فہم کرنے کی پوری کوشش کی ہے
تر باتیں وہی ہیں جو اور کتب عروض میں ہیں۔ اجزاء اوایہ۔ سبب۔ وتد۔
ملہ۔ ان کی قسموں کو اڑا دیا ہے جزاک اللہ۔ پھر اجزاء ثانیہ (ارکان) وہی فاعلن
ن۔ ومفاعیلن وغیرہ ہیں جن کو صاحب گلزار عروض نے بالکل اڑا دیا ہے
ایک ہی اجزاء یا ارکان سے کام نکل جائے تو بہتر ہے۔ مولانا فارسی اردو
ں کے ان تصرفات کو جو عربی عروضیوں کے خلاف ہیں غلطی اور غفلت سے
ر تے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ غفلت اور غلطی مستحسن ہے اور اپنی زبان کی
صیات کے لحاظ سے شاعر کو اس کا اختیار ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ شعر کہے تو ایک
ن میں اور عروض کی پابندی کرے دوسری زبان کی پھر حسب کثرت رائے در
ع ہو جائے تو اسے غفلت کہنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔ اور غلطی سے

جبر کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی نیز اس رسالہ میں ایسی باتیں بہت ہیں جو
ردو عروض سے نہیں بلکہ عربی عروض سے متعلق ہیں ۔ اور بعض ایسی بھی ہیں جن کا عروض سے
علق نہیں مثلاً اعشیٰ ہمیشہ بحر متقارب میں شعر کہا کرتا تھا ۔ بحر متقارب کے بڑے کہنے والے
عربی میں اعشیٰ اور فارسی میں فردوسی ہیں ۔
زحاف مثلاً بحروں کے قدیم نام تو سمجھنا بھی مشکل ہیں اور ان کا یاد رکھنا مشکل تر ۔
لزار عروض میں اُن کے دلکش نام نرگس ۔ سنبلی ۔ ریحانی وغیرہ رکھے ہیں مگر مولانا نے
یہ سلسلہ ہی اڑا دیا کہ اصطلاحی ناموں کی کثرت مٹ گئی اور یہ زیادہ اچھا ہے ۔
بحر وافر کے سلسلہ میں ایک فائدہ بیان کیا ہے کہ (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)
یک وزن ہے کہ عرب مفاعلتن کی فرع مفاعیلن قرار دیکر اسے بحر وافر کہتے ہیں ۔
فارس والوں نے دھوکا کھا کر بحر ہزج کہا ۔ کیونکہ مفاعیلن بحر ہزج کے اصلی ارکان ہیں
ور تین رکن کا شعر اس بحر میں عرب نے نہیں کہا " اور لکھتے ہیں کہ "حقیقت امر یہ ہے
یہ بحر وافر ہی ہے ۔ عرب اس مصرعہ کو سن کر بحر وافر کہے گا ۔ ہم انہیں کے عروض کا
تباع کرتے ہیں ہمیں بھی وافر ہی کہنا چاہیئے ۔"
مگر ہمارے نزدیک اسے بحر وافر کہنا زبردستی ہے ۔ بحر ہزج کے دو اصل رکن اور
یک مزاحف رکن موجود ہے تو بحر ہزج نہ کہی جائے ۔ بلکہ محض تتبع عرب کے لیے فرعی
رکان مانیں اور بحر وافر کہیں ۔ تین رکن بحر ہزج میں ہوں تو گناہ کیا ہے ۔ فارس والوں کا
ل اصل سے قریب تر اور اچھا ہے ۔

بحر بسیط کی بحر میں لکھتے ہیں ۔ "اردو والے اس وزن کو مفاعلن فعولن کے وزن
ستے ہیں ۔ ع نیام تیغ قضائے مبرم نقب ہے قاتل کی آستیں کا ۔ اس
ن کو غلطی سے فعول فعلن سے تقطیع کیا کرتے ہیں ۔ فارسی اردو والوں کا فعولن کو
ل فعلن کر دینا ناجائز ہے "

اس کی بھی کوئی وجہ اتباع عرب اور اس کے سوا نہیں معلوم ہوتی کہ یہ وزن
بسیط کا وزن قرار دیا جائے ۔ ورنہ فعول فعلن سے تقطیع کرنے میں سوا گناہ قدامت
ن کے اور کیا قباحت ہے ۔ متاخرین نے جب بالاجماع یا بہ تعداد کثیر یہ عمل
ہے تو مذہب تقلید کے لحاظ سے بھی جائز ہونا چاہئیے ورنہ آسان پسندی اور
سے قریب تر ہونے کے لحاظ سے تو یقیناً جائز بلکہ مستحسن ہے کہ یہ وزن بحر متقارب
قرار دیا جائے ۔ بحر ہزج اور بسیط کے سلسلہ میں پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ "مفاعلن
ن فعولن کے بجائے جو لوگ مفاعلاتن یا فعولن فعلن سے تقطیع کرتے ہیں وہ غلطی
ں ۔ اور تتبع عروض عرب سے بیگانہ ہیں ۔ اس وزن کی تحقیق سات سو برس کے بعد
ہیچمدان نے کی ہے "

وزن تو حقیقتاً دونوں صورتوں میں درست ہے ۔ کوئی خرابی نہیں آتی ۔ البتہ
مد عروض عرب ہاتھ سے جاتی ہے ۔ اسے غلطی کہیئے تو دوسری بات ہے ۔
فات ماننا فروعی ارکان تسلیم کرنا کیا سہل راستہ ہی ہو سکتا ہے ۔ انہیں
ں نے عروض کو بہت پیچیدہ فن بنا دیا ہے ۔ دیکھئے ہم کب اس بھول بھلیاں سے

نکلتے ہیں۔ یہ تمام بحثیں اُسی قسم کی ہیں جنہوں نے عروض کو بدنام کیا ہے۔ صفحہ (۲۱) سے رُباعی کے اوزان بتائے ہیں جس میں کئی صفحے صرف ہوئے ہیں۔ مگر پھر مولانا کو بھی لکھنا پڑا کہ "عروضیوں نے یہ بیکار (۲۴) وزن گنوائے ......" ہماری رائے میں عروضیوں کی ان بیکار چیزوں سے یہ رسالہ پاک ہوتا تو بہتر تھا کہ اضافہ حجم کے سوا کوئی نتیجہ نہیں۔

صفحہ (۲۵) سے (۳۲) تک چند زحافات ضروری بتلائے گئے ہیں جن کی ضرورت کے متعلق خود مولف کا یہ فیصلہ ہے کہ "ان اصطلاحوں کی ضرورت نہیں ہے محض لفظ زحاف سے کام نکل سکتا ہے۔ اسی طرح اور بھی عروضیوں نے اصطلاحیں بلا ضرورت بنائی ہیں کہ وہ محض بیکار و فضول ہیں۔"

یہ شکایت بقول مولانا علامہ سکاکی کو بھی ہے یعنی بہت قدیم ہے مگر کوئی بندۂ خدا رفع شکایت کی جراءت نہیں کرتا تھا کیونکہ تتبع عرب کا پھندا اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان زحافات کے بیان کا عذر مولانا یوں فرماتے ہیں۔

ان مثالوں سے غرض یہ ہے کہ ترکِ اصطلاحات میں میرا عذر قابل قبول سمجھا جائے تنقیص میری نہ کی جائے کہ بیان عالمانہ نہیں۔"

ہمارے نزدیک یہ جراءت قابل قدر ہے۔ نہ وجہ تنقیص۔ افسوس ہے اُن پر جو اصل مُدعا کو فوت کرنے کے مرتکب ہوں اور اس فن کو اس غرض سے گورکھ دھندا بنائیں کہ ان کا بیان عالمانہ سمجھا جائے۔

۴۱) صفحہ سے (۳۸) تک دفع دخل کے عنوان سے نون غنہ کی بحث ہے۔
ین کے تحت میں عروض سے متعلق بہت سی عمدہ باتیں ہیں صفحہ ۵۱ سے خرم و خزم
ا ہے۔ صفحہ ۶۵ سے حقیقت وزن پر بحث کی ہے۔ پھر تعقید کا بیان ہے جس کا
رچہ عروض سے نہیں مگر مبتدیوں کے لئے مفید ہے غرض صفحہ ۷۹ پر یہ عروض
کی متعلقہ بحثیں ختم ہوتی ہیں۔ جن پر مولانا نے محققانہ و عالمانہ انداز پر نظر
ہے اور فن عروض سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہت سی مفید و کارآمد
عدی ہیں قدیم عروض پر اس وقت تک اس سے بہتر رسالہ نہیں لکھا گیا کچھ
چھند یعنی ہندی عروض کے مولانا نے بتائے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ "اردو میں
ان اوزان میں کہتے ہیں۔ میں نے بھی بہت غزلیں کہی ہیں اور مستعذب۔
خوشگوار) ہیں"۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ عروض عربی کے لحاظ سے
صحیح ہیں لیکن جب شیریں ہیں۔ اور بہ کثرت کلام موجود ہے۔ شعرا کہتے ہیں
روض کے لحاظ سے غلط ہوں تو ہوا کریں۔ اُردو میں زیادہ عنصر ہندی کا ہے
یں سمجھ سکتے کہ اگر اس کی شاعری میں چند ہندی عروض کے اوزان ہیں تو
اُن کو غلط کریں۔ بلکہ ہندی سے اور زیادہ استفادہ کرنا چاہیئے۔
ض جگہ نہایت ثقیل و مغلق الفاظ بھی قلم سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً مستعذب۔
ب وغیرہ قافیہ کی بحث میں تاسیس۔ دخیل۔ قید اخرب۔ اصطلاحات کا
لہ ہے۔۔۔۔۔۔ مگر تعریف کہیں نہیں۔ ہندی یا نہ جاننے والا نہیں سمجھ سکتا کہ

یہ کیا چیزیں ہیں اس طرح اور بحثوں میں کس قدر گنجلک بھی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم بہت خوب ہے۔ مولانا کا یہ رسالہ زیادہ تر عربی وعروض و قافیہ سے متعلق ہے۔ کاش صرف اردو شاعری کی ضروریات کے لحاظ سے عروض و قافیہ کے مسائل کا بیان ہو۔ عربی فارسی اردو کے اختلافات اور ان کے بیان نے پھر کس قدر بحثوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اور پڑھنے والا ان الجھنوں سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ رسالہ کی قیمت کہیں درج نہیں۔ اور نہ ملنے کا پتہ لکھا ہے۔ کاغذ نہایت معمولی۔ لکھائی صاف تاج پریس چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپا ہے۔ اور طباعت غنیمت ہے۔

زبانِ اردو پر سرسری نظر

اُن شبانہ لکچروں میں سے ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے
جلاس میں پڑھے گئے تھے۔ اِس اجلاس کا یہ خاص امتیاز تھا کہ بہت سے
فاضل حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کانفرنس میں علمی اور تعلیمی مسائل
فرمائیں اور جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب قابلِ شکریہ ہیں کہ
دولت کانفرنس کے اس اجلاس میں اچھی خاصی رونق ہو گئی اور علمی چرچا
یا۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی اُردو لکچرار مسلم یونیورسٹی نے اردو زبان
مضمون پڑھا تھا جو اب کسی قدر اضافہ کے ساتھ کتاب کی صورت میں شائع
ن مقالے میں قابل لکچرار نے اُردو کی تاریخ سے زیادہ بحث نہیں کی اور نہ
ضرورت تھی۔ بلکہ اُردو کی موجودہ روش اور آیندہ ترقی کی تدابیر پر بہت دلچسپ
رائی ہے جس میں مختلف مسائل آ گئے ہیں جن میں اختلاف اور بحث کی بہت
ہے۔ صدیقی صاحب نے اُردو کے جدید دور کو غالب سے شروع کیا
نامور شاعر کو جو اپنا مثل اُردو ہی میں نہیں بلکہ بہت سی زبانوں میں نہیں رکھتا
طروں میں ختم کر دیا ہے اور مرزا صاحب کی شاعری پر جو نقادانہ رائے انھوں
ہے وہ قابل سننے کے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "غالب کی شاعری ایک تلخ

صرف ہائے وہواور نا ؤ نوش کی ترجمان ہے۔"

یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اُردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے، خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اردو کا لکچرار ہے۔ اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں "کوئی پیغام" (Message.) نہیں ملتا" کیا شکسپیر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے۔ کوئی "پیغام" ملتا ہے؟ ایک نہیں کئی کئی یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اُردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ پیدا کیا (لیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں) خیالات کی جدت تخیل کی بلندی اور بیان کا لطف جو مرزا غالب کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اُردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنہیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے کے کلام میں کیا مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے اور اُن پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے؟ مرزا غالب کا اثر اُردو شاعری پر عجیب وغریب ہوا ہے اور رہے گا۔ کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے؟ صدیقی صاحب اس بات سے بھی ناراض ہیں کہ مرزا صاحب کا قدیم کلام کیوں چھپا یا گیا (شاید وہ اسے مہمل سمجھتے ہیں) فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ اُردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے۔"

بال اُردو کے ایک پروفیسر کا ہو، حیرت سے خالی نہیں۔ غالباً انہوں نے اس کلام کا
العہ نہیں فرمایا ورنہ انہیں معلوم ہوتا، کہ جن ظالموں کے ہاتھ میں مرزا کے کلام کا
اب تھا، انہوں نے بیدردی سے ایسے ایسے اشعار مجروح کر دیئے جن کی نظیر
لئے مرزا کے کلام کے کہیں نہیں ملتی۔ علاوہ اس کے اس کلام سے اس زبردست
بلند خیال شاعر کی طبیعت اور اس کے کلام کے ارتقا کی صحیح حالت کا اندازہ
ا ہے جس کا جاننا ایک پروفیسر اور محقق کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ممکن ہے
مدیقی صاحب ان امور کو "واقعات کی کھتونی" سمجھیں۔ لیکن اس کے جانے بغیر
ا ہونا ممکن نہیں۔ صدیقی صاحب کے اس طعن آمیز اعتراض (اردو نوازی)
یکھ کر جس کی تلخی پس سے کم نہیں مجھے معاً ایک دوست کا خیال آیا جنہوں نے
ا بار بڑی متانت سے یہ فرمایا کہ آپ جو شعرا کے تذکرے اور شعرا کا کلام چھاپتے
اس سے کیا حاصل ہے۔ کہیں بہتر ہوتا کہ انجمن صابون سازی اور دباغت پر
یں لکھوا کر چھاپتی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے لاجواب ہونا پڑا۔ اور یہی کیفیت
آج پھر محسوس کرتا ہوں۔

اس کے بعد قابل لکھنے والے نے حالی کا ذکر فرمایا ہے اور شکوۂ ہند کے چند شعر لکھ کر
ئے دی ہے کہ "چونکہ اُن کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہے اس لیے حالی کو بجا طور پہ
ں کا شاعر کہنا چاہیئے۔" لیکن اسی جملے کے پہلے حصہ میں فرماتے ہیں کہ حالی نے
زمانے کی صحیح مصوری کی ہے اور ان معنوں میں اُن کا شمار حقیقی شعرا میں ہو سکتا ہے

بظاہر ان دونوں جملوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن جو مطلب ہے وہ ظاہر ہے۔ اپنے زمانے کی صحیح تصویر کھینچنے والا "ماضی" کیسے ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ حال کو ماضی سے جدا نہیں کر سکتے اور ہر حال ماضی ہو جاتا ہے۔ لیکن مولانا حالی مرحوم نے اپنے وقت کے حال پر اس کثرت سے لکھا ہے کہ وہ ان کو بجا طور پر حالی ہی کہنا موزوں ہوگا۔ پھر انسانی فطرت کے متعلق جو ہو سکتے وہ لکھ گئے ہیں ان کا جواب اب تک ہماری شاعری میں نہیں ہے۔ البتہ شوخی اور تمسخر ان کے کلام میں نہیں اور نہ وہ وقت ان خوش فعلیوں کا تھا۔ کسی مصنف یا شاعر پر اس وقت تک صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی جب تک انسان اس کے پورے کلام کا مطالعہ نہ کر لے ورنہ ایسی رائیں ادھوری اور ناقص ہوں گی۔

حالی کے بعد اکبر کا ذکر آتا ہے اور بہت سے شعر نقل کر کے جن میں سے اکثر زبان زد عام ہیں اُن کی شوخی ظرافت اور حکیمانہ نکات کی تشریح کی ہے۔ ان اشعار کو صدیقی صاحب "لسان العصر کے الہامات" فرماتے ہیں۔

یہاں تک ماضی و حال کی ترجمانی تھی اب مستقبل شاعر کا ذکر ہوتا ہے جس سے ان کا مطلب اقبال سے ہے۔ یہ بیان بہت طویل اور پُرزور ہے۔ اور قابل لکھنے والے نے اپنی طبیعت کا سارا زور اس پر صرف کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری سے انکار کرنا کفر ہے اور نہ ہمیں اس سے چنداں اختلاف ہے جو صدیقی صاحب نے اس حقیقت شناس شاعر کی مداحی میں بیان کیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اقبال کا جس قدر

وں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے وہ سب کا سب فارسی کے ہیں
ایک شعر بھی کہیں نقل نہیں کیا۔ حالانکہ بحث سراسر اردو سے ہے۔
صدیقی صاحب مُردوں سے بہت بیباک ہیں لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں کیا
اسنے ہر زندہ انشا پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے۔
تعریف کی ہے اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا دبی زبان سے کوئی جملہ کہہ
ا ہے تو جھٹ اُس کی پیٹھ بھی تھپک دی ہے تاکہ وہ چیں بجبیں نہ ہونے پائے
ں کی داد دیتا ہوں کہ کوئی نام ایسا نہیں چھوٹنے پایا جس سے ذرا بھی اندیشہ
نا ہے۔
س کے بعد اردو زبان اور اس کی ترقی کے متعلق مختلف مسائل پر بحث کی ہے
ریجی پہلو۔ رسم الخط فارسی عربی کا تعلق، اردو کے معلّم کی صفات، عامیانہ
(جسے قابل لکچرار نے "جھانپلزم" سے موسوم کیا ہے) انجمن اردو نے
پ کانفرنس معلمین اردو، اکاڈمی، انسائیکلو پیڈیا، اردو مکاتب، اردو گفتگو
تالیف اور تصنیف، افسانہ نویسی) یہ بحثیں اگرچہ مختصر ہیں مگر بہت دلچسپ اور
ہیں۔ انہیں پڑھ کر جی للچاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے، لیکن اس تبصرے میں
بائش نہیں۔ صدیقی صاحب نے بعض ایسی باتیں سجھائی ہیں جو غور اور بحث کے
یں اور ان میں سے ہر عنوان پر علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لکچر کا ایک
فائدہ یہ ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔ انجمن اردو نے معلّی قائم ہو گئی۔

یہ بڑی مبارک فال ہے اور ہمیں امید ہے کہ صدیقی صاحب کی پُرجوش نگرانی میں یہ پھولے پھلیگی ۔ اربابِ یونیورسٹی کو اس پر خوش ہونا چاہیئے اور اس کی امداد میں دریغ نہ کرنا چاہیئے یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک رسالہ اردوئے معلی کے نام سے جاری کیا جائے گا۔

صدیقی صاحب قابلِ شکریہ ہیں کہ انہوں نے اس لکچر کو شائع کرکے اردو کے بہی خواہوں کو بعض ضروری امور کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ ان کے طرزِ بیان میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے ۔ لیکن بعض اوقات لفظی الجھاؤ سے الجھن پیدا ہونے لگتی ہے ۔ صدیقی صاحب اردو کے ان انشاپردازوں میں سے ہیں جن سے بڑی بڑی امیدیں ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی افتاد کدھر لے جاتی ہے ۔ جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے اسی میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں ۔

یہ لکچر بڑی تقطیع کے ۵۲ صفحہ پر ہے ۔ مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں بہت خوشخط اور اچھا چھپا ہے ۔ معلوم نہیں کس سے اور کتنے میں ملتا ہے شائقین منیجر صاحب مطبع مذکور سے رجوع کریں ۔
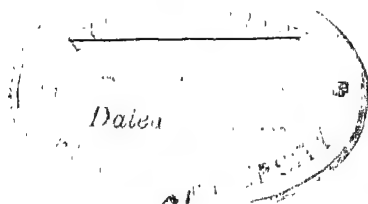
خطوط سرسید

ام طور پر اور خاصکر نامور لوگوں کے خانگی خطوط کی قدر اس لیے بھی ہوتی ہے
پنے دوستوں اور عزیزوں کو بے تکلفی میں ایسی رایوں اور خیالات کا اظہار
ے ہیں جن کا علانیہ کہنا یا لکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن سرسید
ر اس خوبی (یا عیب) سے پاک ہیں ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ جو اُن کے
ں تھا وہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ مصلحت یا پالیسی اُن کے ہاں کوئی چیز نہ تھی
ب ہم اُن کے خطوط کو جو اُن کے رشید پوتے سید راس مسعود صاحب المخاطب
مسعود جنگ بہادر نے جمع کر کے چھاپے ہیں، پڑھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور سوائے بعض خطوں کے تقریباً ہر خط میں ان کے
ف نظر آتے ہیں۔ وہ محبت کی باتیں بھی کرتے ہیں، بے تکلف دوستوں سے
ا اور شوخی سے بھی نہیں چوکتے مصیبت میں ہمدردی کرتے اور خوشی سے خوش
معاملات میں رائے بھی دیتے ہیں سوالات اور استفسارات کا جواب
تے ہیں لیکن قوم کا دکھڑا ہر جگہ روتے ہیں یہ خیال کسی دم ان کے دل سے
ں ہوتا۔ اس کی حالت تپ کہنہ کی سی ہو گئی ہے جو ہڈیوں تک میں رچ گئی ہو
یا ایک آگ ہے جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے

صداقت اور خلوص ٹپکتا ہے اور باوجود بعض لغزشوں کے اسی میں اُن کی جیت تھی اس مجموعہ کے پڑھنے سے اُن کی طبیعت اور سیرت اور اخلاق کا آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ کھچ جاتا ہے اور دل پر اثر ہوتا ہے۔

اُن کی پُر خلوص اور دلی محبت کا اندازہ کرنا ہو تو نواب محسن الملک اور مولوی زین العابدین خاں مرحوم کے خط پڑھیئے۔ ان کا استقلال اور ضد اور اسی کے ساتھ صفائے باطنی دیکھنی ہو تو نواب وقار الملک کے نام کے خط ملاحظہ کیجئے۔ اُن کی خو، قومی ثبات اور غیرتمندی دیکھنی ہو تو وہ خط مطالعہ فرمائیے جو لندن سے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ اُن کی قدر دانی کا حال جاننا ہو تو نواب عماد الملک بہادر کے نام کے خط دیکھئے۔ چھوٹوں پر شفقت دیکھنی ہو تو عنایت اللہ صاحب کے نام کے خط پڑھیئے۔

جس طرح اُن کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہ تھا اسی طرح اُن کی عبارت بھی ہنر نما عیب سے خالی نہیں وہ بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اُسی طرح ادا کر دیتے ہیں لیکن اس بے تکلفی اور بیساختہ پن میں بعض وقت عجیب عجیب فقرے اُن کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔ سید صاحب کو بُرا کہنا اُس زمانہ میں فیشن سا ہو گیا تھا جس میں اچھے اچھے لوگ مبتلا تھے۔ مولوی سراج الدین احمد صاحب نے اپنے اخبار سرمور گزٹ ناہن میں کسی ایسی ہی تحریر کا جواب لکھا تو اُسے دیکھ کر سرسید نے انہیں تحریر فرمایا کہ اس قسم کے جواب لکھنے کی

نا نہیں اگر ہمارے بُرا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے۔ خوش کر لینے دو
ے بُرا کہنے سے خوش ہو۔ کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں، ہم کو گناہوں سے
تے ہیں۔"

لانا حالی مرحوم کا مسدس جس وقت اُن کے پاس پہنچا ہے تو جو خط انہوں نے
ت اس بے نظیر کتاب کے پڑھنے کے بعد لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے
ے اُن کے دل کی کیفیت اور جوش کا حال معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ
ت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم
فسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی
ید قرار دیجائے، تو بالکل بجا ہے کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر
ے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ
تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے۔ بالکل مبرا ہے
ی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں
نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔
یت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے
، یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں
نا محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو باس اس میں
ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے، جن میں میری طرف اشارہ ہے بیشک

میں اس کا محرک ہوا اور اس کو اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے مسجدوں کے اماموں کو چاہئے کہ نمازوں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کرا دی جائے میں دل سے شکر کرتا ہوں، مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جائے جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی ۔ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں مسدس گا تی ہوں ۔"

نواب عماد الملک بہادر کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھ کو کمال خوشی اور عزت اس میں ہے کہ آپ سا شخص جس کو میں دل اور جان سے باعتبار طینت کے ایک فرشتہ صفت خیال کرتا ہوں اور باعتبار علم و فضل اور خاندان کے اپنی قوم کا سر دار جانتا ہوں اور صرف سردار ہی نہیں بلکہ میں صدق دل سے باعث افتخار قوم سمجھتا ہوں ۔ اگر آپ میرا دل چیر کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کس قدر مجھ کو اس بات سے خوشی اور عزت ہے ۔"

مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) سے تو انہیں عشق تھا اور اُن کے نام
ندر خط ہیں اُن سے ان کی محبت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ کتاب کے شروع
یک دیباچہ (۲۸) صفحہ کا مولوی عبداللہ خان صاحب وکیل سہارنپور نے لکھا ہے
سید مرحوم کے جاننے والوں میں سے تھے۔ اس دیباچہ میں انہوں نے سر سید کے
کی حالت، اُن کی مساعی اور تالیف و تصنیف کا حال نہایت خوبی سے
لیا ہے۔

اس مجموعے میں کل خطوط (۲۴۳) ہیں جو بڑی تقطیع کے (۲۴۲) صفحوں پر چھپے
کتاب نظامی پریس میں چھپی ہے اور اچھی چھپی ہے۔ باوجود صحت کے اہتمام کے
ہیں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ سرورق پر خود جناب مرتب کا خطاب
چھپ گیا ہے یعنی بجائے مسعود جنگ کے مسعود بار جنگ لکھ دیا گیا ہے۔ قیمت
ہیں نظامی پریس بدایوں سے مل سکتی ہے۔

بانگ درا

اقبال اس وقت اردو کے سب سے مقبول اور اعلیٰ شاعر ہیں۔ ان کا کلام اب تک متفرق تھا اور ایک جا جمع ہو کر شایع نہیں ہوا تھا۔ ان کے کلام کے دلدادہ اس سے مطمئن نہ تھے اور ایک مدت سے منتظر اور مشتاق تھے کہ سارا مجموعہ کتاب کی صورت میں شایع ہو جائے۔ کس قدر مسرت کی بات ہے کہ وہ آب دار موتی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جن کی جوت سے آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔

کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے "ہمالہ" ہے۔ کوہ ہمالہ ہندوستان کی شوکت و شان کا نشان اور اس کے حفظ و امن کا پاسبان ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔ جس شاعری کی ابتدا "کوہ ہمالہ" ہو اس کی انتہا کیا ہو گی؟ میں اقبال کے لئے اس میں نیک شگون پاتا ہوں۔ وہ محاسن جو بعد میں ہم نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اقبال کے کلام میں نکالے اُن سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی بات جو ہم اس میں دیکھتے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حب وطن کی بو آتی ہے۔ اور

یوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چند ہی صفحوں کے بعد
لئے دل" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ شاعر درد دل سے
کہتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
میں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں — اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اس کے نیچے ہی ہندوؤں کے مقدس منتر گایتری کا ترجمہ ہے جو اس قدر پاک
کیا جاتا ہے کہ غیر ہندو کے کان میں اس کی آواز تک پہنچنا ناجائز سمجھا جاتا ہے
جس اخوت کی انہیں تلاش تھی اس کے لئے پھولوں کا ایک ہار گوندھا ہے چند
س کے بعد سید کی لوح تربت ہے جس پر یہ ہدایت درج ہے۔

کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

اس سے ذرا آگے ایک اور نظم "تصویر درد" آتی ہے جو درحقیقت بے مثل
سراپا درد ہے اور شاعر نے دل کھول کے اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

لاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشاں برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

اسی نظم کے ایک بند میں کس حسرت سے یہ شعر کہا ہے۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اور کیا خوب کہا ہے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

اسی نظم میں ایک شعر ہے جو ملک کی اس وقت کی حالت کا صحیح نقشہ ہے۔

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

چند ہی ورق الٹنے کے بعد "ترانۂ ہندی" آتا ہے جسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے

ص ۔ عالم و جاہل سب کی زبان پر جاری تھا ۔ اس کا ایک ایک لفظ حب وطن
یا ہوا ہے ۔
ں کے بعد ہی "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے جو وطن کی محبت کا رکھ
ور جس کا پانچواں مصرعہ یہ ہے "میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے"
م ہوتے ہی ایک اور نظم آتی ہے جس کا نام "نیا شوالہ" ہے ۔ یہ شاعر کے
کمال کا نمونہ ہے ۔ اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے
ہے جو ہر انجمن اور ہر کانگریس کے ہال میں سونے کے حروف سے لکھے جانے
ا ہے اور ان کے اسٹیجوں پر بجائے بدنما کرسیوں اور میزوں اور جھل اور
آرایش کے نیا شوالے کی تعمیر ہونی چاہیئے جہاں ہر پرستار وطن کا سر جھک جائے
ں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو ۔ اس نور کی جھلک ہر مذہب
ہ باقی ہے لیکن اس کی تکمیل کسی نے نہیں کی ۔ ہر زمانے میں ایسے پاک نفس اور
ن لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اتحاد و محبت کا بیج بونا چاہا لیکن ان کی کوششیں
ے فرقے میں محدود رہ گئیں ۔ شاعر ان تمام فرقہ سازیوں اور فرقہ بازیوں کو
فنا ہے ۔ ہر انسان جو تعصبات اور روایات کے گرد و غبار سے الگ
اف کے ساتھ غور کرے گا تو اسے وہ حقیقت نظر آئے گی جہاں شاعر کی
ہے لیکن تعصبات پھر غالب آجاتے ہیں اور آئندہ دل کو مکدر کر دیتے
ا یہ نہیں کہتا کہ جہاں شاعر پہنچا ہے وہاں تک کوئی اور نہیں پہنچا بیشک

بعض لوگ وہاں تک پہنچے ہوں گے لیکن انہیں اظہار حق کی توفیق نہیں ہوئی اقبال نے اس حقیقت کو بلا خوف ملامت ظاہر کر دیا۔ لیکن اس پر قائم کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ ہم اس وقت جو جوشن ملک میں محبت و اتحاد قائم کرنے کے لئے کر رہے ہیں وہ سب اپری اور عارضی ہیں حقیقت سے دور اور حق سے نا آشنا ہیں۔ وحدانیت اور اتحاد کا راز نئے شوالے میں ہے۔

نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی شاعری کا پہلا دور ختم ہوتا ہے۔ اس دور کا نام میں نے حب وطن رکھا ہے۔ دوسرے دور کا آغاز اس مجموعے کے دوسرے حصہ سے ہوتا ہے جسے میں نے حب ملت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ انگلستان ہمارے نوجوانوں کی کسوٹی ہے۔ ان کے اصل جوہر وہاں جا کر کھلتے ہیں۔ ان کے لئے وہ ایک نیا عالم ہوتا ہے۔ جدید تمدن کی روشنی بعض اوقات ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے کچھ دنوں کے بعد جب سنبھلتے ہیں تو اپنے امتحانات کے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ نئی لطف اندوزیوں میں بسر ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں وطن کی لو لگی ہوتی ہے وہ طرح طرح کے منصوبے گھڑتے اور وطن کی خدمت کے لئے نئے نئے خیالات سوچتے ہیں۔ بعض تو نہر سویز تک پہنچتے پہنچتے دھیمے پڑ جاتے ہیں اور کچھ جو ثابت قدم رہتے ہیں شروع شروع میں یہاں آ کر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن وہ چنگاری جو سات سمندر سطے کر کے سلگتی ہوئی آئی تھی۔

ں کے حالات اور صحبتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بجھ کے خاک ہو جاتی ہے۔
ذکا ایسا نکل آتا ہے جو باوجود موانعات کے کام کرتا رہتا ہے اور کچھ کر گزرتا ہے
وہ امتحانوں کے لئے انگلستان جاتے ہیں لیکن اصل امتحان ان کا ہندوستان
ہے جس میں اکثر ہیٹے نکلتے ہیں۔ اس کا دوش تنہا انہیں پر نہیں بلکہ ہمارے
حالت۔ تعلیم کا طریقہ گھروں کی صحبت۔ انتخاب کی غلطی اور اسی قسم کے اور
بھی اس کے ذمہ دار ہیں اور ان کو الزام دینا ہی غلطی ہے۔ وہ نہ اس خیال سے
ں اور نہ ان خیالات کو لیکر آتے ہیں۔ وہ جس غرض سے جاتے ہیں اسے کچھ نہ کچھ
ہی لیتے ہیں لیکن اقبال کا جانا اس عام گلے کا سا جانا نہ تھا جو ہر سال یہاں کا
ز بھر کر دیار مغرب کو جاتا ہے۔ وہ ایسے وقت گئے تھے جب کہ ان کی طبیعت
میں پختگی آچکی تھی۔ ملک کی حالت سے واقف اور زمانے کے تیور پہچان چکے
ب وطن کی لو لگی ہوئی تھی۔ ملک میں ان کا کلام مقبول ہو چکا تھا اور اقبال کا
وطن کے گیت دیس کے گلی کوچوں میں گائے جا رہے تھے۔ یورپ میں ان کی
نے کیا کیا تماشے دیکھے۔ کیا کیا خیالات دل میں موجزن ہوئے۔ کیسے کیسے
بے سوچے۔ کیا کیا سامان اپنے ملک کے لئے جمع کئے۔ کیسے کیسے ارادے
ل ہی دل میں رہ گئے۔ یاد وطن نے کس کس طرح بیقرار رکھا اور اپنی قوم کی
دیکھ کر دل پر کیا کیا صدمے گذرے اور اس کے ابھارنے کے لئے کیا کیا
پیدا ہوئے؟ ان کا جواب یا تو وہ خود دے سکتے ہیں یا ان کا کوئی راز دار دوست

لیکن اس زمانے کے کلام کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نئے مشاہدات اور خیالات نے اُن کے دل میں ایک جوش اور تلاطم پیدا کر رکھا ہے جن کے اظہار کے لئے وہ بیتاب اور مجبور ہیں۔ ان خیالات کو انہوں نے اس نظم میں موزوں کیا ہے جو شیخ عبدالقادر صاحب کے نام ہے جو یورپ میں ان کے ہم سفر ہم مشرب وہم راز تھے۔ یہ گویا اُن کی آئندہ زندگی کا پروگرام ہے جس پر وہ خود عامل ہونا چاہتے ہیں اور دوسرے کو عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس خط کے یہ دو شعر ان کے دردِ دل کو ظاہر کرتے ہیں۔

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ　　　چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں　　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

انگلستان کے قیام کے زمانے اور اس کے بعد کے کلام سے دو باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں جنہوں نے ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان کی نظروں میں مکڑی کے جالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ اس پر انہوں نے بڑی بڑی کاری ضربیں لگائی ہیں۔ ان کے یہ شعر مشہور اور زباں زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی + جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

دوسرے وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پہ

ہوا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے سخت بیزار ہیں۔

تنگ نظری اور خودغرضی کو دنیا کے لئے باعث ہلاکت اور موجب آفت

رتے ہیں چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر

پر نازل ہوئی۔ اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی

و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی او

ی زندگی جو بے روح اور صداقت سے خالی ہے انہیں اس عقیدے پر اور

لم کر دیتی ہے۔ اس طوفان سرمایہ داری و استبداد میں انہیں ایک ہی رشتہ و

نی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافی حدود اور نسل و رنگ کے

سے بالا ہے۔

مارے جہاں نہیں ہے اس کو عرب کے معمار نے بنایا ‏ ‏ ‏ ‏ بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اسی خیال کو دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں۔

ت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر ‏ ‏ ‏ ‏ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان کی ان کوششوں کو جو ملک کے محب وطن

پیدا کرنے کے لئے کر رہے ہیں مسلمانوں کے حق میں ایسی ہی ہیچ و پوچ سمجھ

جیسے مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کی کوششیں اتحاد عالم کے لئے

رماتے ہیں۔

ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا ۔ بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "ترانہ ہندی" کے جواب میں "ترانہ ملی" لکھ کر
س کے اثر کو کم کرنا چاہا جو ان کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کے بعد "وطنیت"
نظم میں کھلم کھلا اپنے عقیدے کا اعلان کر دیا ہے اور مسلمانوں کو اس تازہ اصنام وطنیت
سے بچنے کی ہدایت کی ہے کہ وطن پرستی بھی بت پرستی ہے۔

سلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس کے بعد کہتے ہیں۔

بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
زو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — وہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

ام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
لی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ ان خیالات کو بار بار اس سے زیادہ جوش اور حسن کے ساتھ بیان
تے ہیں اور اس سیاسی وطن کو اصول اسلام کے خلاف بتلاتے ہیں۔ ان کی
روں میں قرون اولیٰ کا سماں سمایا ہوا ہے۔ وہ وہی سادگی، جمیت، ایثار
اخوت چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلم اپنی قدر اور اسلام کی حقیقت سمجھے
ھر کائنات سے ہے اور یہ زمانہ جو صداقت سے بیگانہ ہے ان اصول کا منتظر ہے جو
لام کی تعلیم میں پنہاں ہیں۔

ہیں غارت گر باطل پرستی ہیں ہوا — حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی ہیں ہوا
یا ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے — میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

وہ نصاریٰ وضع اور ہنود سیرت مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ وہ مغربی تہذیب
س کی رعنائیوں میں منافقت اور خود فروشی، اس کی جمہوریت میں استبداد
ہ کے آئین میں قیصریت دیکھتے ہیں۔ اشاعت تعلیم و تہذیب کے دعوے۔
ح و تنظیم کی مجلسیں، حقوق و مراعات کی قراردادیں دھوکے کی ٹٹیاں ہیں
لی آڑ میں مغرب کا فرمانروا اقوام عالم کا شکار کھیلتا ہے لیکن یہ ستم پیرایا

اور حکمتیں ناپائیدار ہیں۔ عنقریب مٹنے والی ہیں۔ دنیا بہت جلد ان سے تنگ آجائیگی اور بُری طرح انتقام لے گی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس رمز کو سمجھ جائیں۔ آنے والے دن کے لئے ابھی سے تیار ہو جائیں۔ ان میں پھر وہی پہلی سے اسلامی حرارت پیدا ہو۔ وہی عزم اور ولولے ہوں۔ وہی مساوات اور اخوت ہو۔ اُن کی منتشر جمعیتیں ایک شیرازے میں بندھ جائیں مختلف فرقے اور مختلف اسلامی دولتیں ایک ہو جائیں تاکہ وہ دنیا کی رہنمائی کر سکیں۔ دنیا اپنی حالت سے بیزار اور اپنے آئین سے تنگ آگئی ہے۔ وہ خودکشی پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی آڑے آسکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ کیونکہ دنیا ایسے نظام کی منتظر ہے جو سرمایہ داری سے پاک ہو جس میں حاکم و محکومیت کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ جہاں امیر و غریب ایک ہیں۔ جس کی تہذیب میں نفسانیت اور تعلیم میں دنائت نہ ہو جس کا خدا ایک جس کا آئین ایک جس کا خیال ایک اور جس کا مطمح نظر ایک ہو۔ اور جو شروع سے آخر تک توحید ہی توحید ہو اور کہیں دوئی کا نام نہ ہو۔ ایسا نظام سوائے اسلام کے اور کونسا ہو سکتا۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب کہ اسلام کا بول بالا ہوگا دنیا کی اقوام اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گی۔ اس کی پاک تعلیم سے پرانا ناسور مندمل ہوگا۔ امن و امان اور اخوت و مساوات کا دور ہوگا۔ اس وقت سچا مسلم اقوام عالم کا امام اور اس جہان کا خلیفہ ہوگا۔ یہ ہے وہ آرزو جو ہمارے شاعر کے دل میں موجزن ہے اور جس پر اس کے

اور شاعری کی ساری قوت صرف کر دی ہے۔ زمانے اسلام

ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات ۔۔۔ ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ۔۔۔ نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر
ے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا ۔۔۔ ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
اگر مسلم کے مذہب پر مقدم ہو گئی ۔۔۔ اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

نہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا ۔۔۔ کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

ایک چھوٹی سی نظم تین بیتوں کی مذہب پر لکھی ہے جو یہ ہے۔

ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نکر ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار ۔۔۔ قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
من دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں ۔۔۔ اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ملت نہ وطنیت پر ہے نہ قومیت و
ل پر بلکہ مذہب پر ہے۔ اس کی قوت اور اتحاد سیاست یا قانون پر نہیں بلکہ دین پر
ہب ان کے شیرازۂ اتحاد کو جو اب ڈھیلا پڑ گیا ہے مضبوط کرے گا۔ اسی کی
ولت سب مختلف اور منتشر قوتیں ایک جا ہوں گی اور اسلامی ملت ایشیا کی
ہیں سارے عالم کی رہنما اور امام ہوگی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور
رمایہ داری اور استبداد سیاست اور رقابت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ ہے

اقبال کا خواب جس کی تعبیر پردۂ خفا میں ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے مذاہب یا اقوام سے نفرت کرتا ہے یا ان سے تعصب رکھتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ اس نے رام۔ نانک سوامی نیرتھ رام پر بھی ایسی ہی سچائی اور جوش سے نظمیں لکھی ہیں جیسے اپنے پاک نفس بزرگوں کے لئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدت کے غور و فکر اور تجربہ کے بعد اس نکتے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی اقوام کی یکجہتی کی بنیاد سوائے ملت اسلام کے بودی اور خلل پذیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سوائے ملت اسلام کے کسی قوم کو دنیا کی خلافت کا اہل نہیں سمجھتے۔ انہوں نے جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ خلوص۔ صداقت اور جوش سے بھرا ہوا ہے وہ عاشق و شیدائے اسلام ہے اور عاشق کو ہر جرم معاف ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ آخر آخر میں ان کا میلان طبع فارسی کی طرف زیادہ ہوتا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے خیالات آسانی سے ممالک اسلام میں شایع کر سکیں اور ملت اسلام کو ایک جمعیت بنانے میں مدد دے سکیں۔ کیونکہ جب اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو شاعر کی درد بھری آواز لوگوں کے مردہ دلوں میں کھولن پیدا کرتی ہے اور انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جناب شیخ عبدالقادر صاحب نے اس مجموعے کے شروع میں ایک پر لطف دیباچہ لکھا ہے جو صرف شیخ صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔ اس میں انہوں نے اقبال کے کلام پر تنقید نہیں کی بلکہ ان کی شاعری کا نشو و نما اور تدریجی ترقی دکھائی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں

ہیں" دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا۔
بال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعۂ خیال بنا لیا۔
شیخ صاحب نے کئی اسباب بتائے ہیں جنہیں میں انہیں کے الفاظ
رنا چاہتا ہوں۔ ۱۳

رسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی
ہیں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب حالات تصوف کے متعلق لکھنے
جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیر مذاق میں دخل ہوگا۔ اس کے علاوہ
ں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا! ور دقیق خیالات کے اظہار
ا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے
ی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے
ردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل
مگر بظاہر جس چھوٹے سے موقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی وہ
ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں اُن سے فارسی
سانے کی فرمایش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔
راف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے
نہیں کی۔ مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمایش سے ایسی تحریک ان کے
پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید

فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا۔

شیخ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں جائے دم زدن نہیں۔ بیشک بہی اسباب فارسی کی طرف ان کے میلان طبع کے ہوئے ہوں گے۔ لیکن جس چیز نے مستقل طور پر فارسی میں کہنے کی طرف مائل کیا وہ وہی خیال ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنے ملت اسلام کے افتراق و نفاق کو دور کر کے اسے ایک قومی جمعیت بنانا جس کی بنا خالص اسلام پر ہو۔ اسے کاہلی اور نکبت سے نکال کر عمل اور جد و جہد کی طرف مائل کرنا۔ اہل ملت میں وہ بصیرت اور خلوص پیدا کرنا کہ ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں شمع ہدایت ہو اور بالآخر انہیں اقوام عالم کی سرداری اور امامت کے لئے آمادہ کرنا۔ یہ تعلیم اُن کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے خواہ وہ کسی ملک اور کسی نسل کے ہوں۔

لیکن ہند کے مسلمان عجیب کش مکش میں ہیں۔ جب حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ نشۂ دولت سے ذرا ہوشیار ہوئے تو ہادی نے انہیں یہ ہدایت کی کہ دول اسلام سے تعلق یا محبت رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ ادھر اہل وطن سے

بھی دشوار رہے ہے کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ اور ہم کم ہیں۔ اگر رہے تو ان کے
ہو کے رہنا پڑے گا۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ انگریزوں سے جو فرمارو ائے
ہیں حل کر رہا ہو۔ اسی میں تمہاری خیر اور تمہاری زندگی ہے۔ ایک مدت
پر کار بند رہے لیکن سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں۔ یہ طلسم بھی ٹوٹ کے رہا
کے بعد رموز سیاست کے شناسا اور زمانے کے نباض آئے اور ہدایت
کہ اگر ہمیں عزت کے ساتھ زندہ سلامت رہنا ہے تو اہل وطن سے
ہتی اور اتحاد پیدا کریں ورنہ ملک ہمیشہ پامال رہے گا اور ملک والے
غلامی سے نہ نکل سکیں گے۔ سارے ملک میں اس سرے سے اس
ے تک صلح و آشتی کی لہر دوڑنے لگی۔ اتحاد و اتفاق کے ترانے گائے
لگے اور لوگوں کے سینے صلحکاری اور محبت کے نور سے معمور نظر آنے
ور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک مدت کے بعد اس ملک پر خدا کی رحمت
ہونے والی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بالقین تھی کہ اگرچہ حب وطن ایمان ہے
سلامی ریاستوں سے محبت و ہمدردی کا تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔ ہندو
اسے تسلیم کیا اور عالی ظرفی سے ساتھ دیا۔ دونوں بچھڑے بھائی پھر
ے اور اخلاص و محبت سے رہنے لگے۔ نہ معلوم کس کی نظر لگ گئی کہ
ٹ پڑ گئی اور چار دن کی چاندنی کے بعد پھر اندھیرا گھپ ہو گیا۔ خدا
گوں کی ہمت میں برکت دے جواب تک اس اتحاد کے پیدا کرنے میں

سچے دل سے ساعی ہیں۔ اب ہندو اپنی تنظیم الگ کر رہے ہیں اور مسلمان الگ فکر میں ہیں کہ اپنی جمعیت درست کریں۔ بہر حال کچھ دنوں کے لئے یہ کھکھیڑ ان کی قسمت میں اور لکھی ہے۔ ٹھوکریں کھا کر ایک دن رستے پر آ ہی جائیں گے۔

یہ سیاست دانوں اور ملک کے رہنماؤں کی تدبیریں تھیں۔ شاعر اور حکیم کی صدا ان سے نرالی ہے وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وطنیت کا خیال ہیچ و پوچ ہے سیاست ایک قسم کی عیاری ہے۔ تہذیب و آئین مغربی غول راہ ہے۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ وہ ان پھندوں میں نہ پھنسیں وہ مذہب کو رشتۂ اتحاد بنائیں۔ وہ خصائل اور اخلاق پیدا کریں جو قرون اولی کے مسلمانوں میں تھے اور ان اصولوں پر کاربند ہوں جو تیرہ صدی پہلے انہیں دئے گئے تھے اور اس پاک تعلیم کے زور ایشیا کی رہبری کریں اور پھر ایک بار عالم پر چھا جائیں کیونکہ دنیا کی نجات اسی میں ہے۔ یہ ہے اقبال کا پیام ملت اسلام کے نام اور سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد سے اس آواز میں زیادہ گونج اور قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ بہت اعلیٰ خیال ہے اور مسلمانوں کے لئے بہت خوش آیند ہے لیکن ڈر ہے کہ اس خیال کی شدت کہیں ہمیں ہندوستان سے غافل نہ کر دے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جو دلی محبت ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ہم اسے جنگ بلقان اور خلافت کے معاملے میں خوب دیکھ چکے ہیں۔ کیا ان کو بھی ہندی مسلمانوں سے ایسی ہی محبت ہے؟ ہندی ہر خطے میں حقیر سمجھا جاتا ہے

غلام سے زیادہ اس کی وقعت نہیں۔ ہندی مسلمان کی خود اسلامی ممالک میں کوئی
ت نہیں۔ جب تک ہم اس ملک میں جہاں رہتے ہیں اپنی حیثیت مضبوط نہ کرلیں
جب تک ہم یہاں آزادی خیال اور آزادی عمل کو حاصل نہ کریں ملی اتحاد کا خیال
ب ہی خواب ہے۔ اگر مسلمان ملک کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش
تحاد و ترقی میں جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو انہیں اس ملک میں رہنے کا
ق ہے؟ وہ لوگ کیا دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں جو بے اجازت اپنے ملک سے
باہر نہیں رکھ سکتے اور جو بے اذن کسی عملی ہمدردی کے قابل نہیں ہیں۔ جب
اپنے ہی ملک میں بیگانہ اور آپس کے تفرقوں کے شکار رہیں تو دوسروں کے سامنے
منہ سے اتحاد کی تعلیم پیش کریں۔

تاہم اقبال کے پیام میں بلندی اور ایسا خلوص اور جوش ہے کہ وہ رائگاں
ں جا سکتا۔ وہ سوتوں کو جگانے۔ غافلوں کو ہوشیار کرنے اور دلوں کے ابھارنے
بلی کا سا کام کرے گا۔ اس کا مقصد سیاست یا ملک گیری نہیں بلکہ وہ اخلاقی
روحانی پیام ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیم پر ہے اور جس کی غرض اسلامی
ل اور آئین کی اشاعت ہے جو اتحاد ملی کے ذریعہ سے دنیا پر کارفرمائی کر سکتے
لیکن ساتھ ہی انہیں اپنے "ترانۂ ہندی" کو بالکل بھلا نہیں دینا چاہیئے۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

عجمی خُم ہے تو کیا   مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

مگر افسوس کہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا جاتا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں صرف عجمی خم اور حجازی بادہ ہی نہ رہ جائے اور اس خیال کی تصدیق مجھے اس شعر سے ہوئی جو بعد کا کہا ہوا ہے۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

لیکن اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔ اس لئے ہم اس درخواست میں شیخ عبدالقادر صاحب کے ساتھ شریک ہیں "کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق ہے۔ خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑھ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے نکلوایا تھا اس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں "یہی نہیں کہ اردو ان کے خیالات سے محروم رہ جائے گی بلکہ ان کا پیام جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے ہیں تشنہ اور اثر سے محروم رہ جائے گا۔

اقبال کی شاعری یا ان کے پیام پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ہمیں قدامت پرستی کی طرف مائل کرتی ہے اور بجائے آگے قدم بڑھانے کے وہ ہمیں

ـدیوں پیچھے لیجانا چاہتی ہے۔ لیکن اس کی انہیں مطلق پرواہ نہیں بلکہ اس پر جوش
ں اور ایک گونہ فخر کے ساتھ خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

ں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں　　اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے　　میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
امنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں　　دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

لیکن ان کی قدامت پرستی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اداسی پیدا
ں ہے۔ بلکہ وہ ان اصول کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے
اپنے پیام میں عہد ماضی کی روشن مثال دکھا کر بار بار انہیں عمل اور جد و جہد اور
ت پر آمادہ کرتا ہے۔

آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے یہی　　جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ ادا کیا ہے۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے

یہی خیال اس شعر میں بھی ہے:۔

ت ہے خرام کا سن تو ذرا پیام تو　　زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار ہے

کوشش ناتمام کے متعلق کہتے ہیں:۔

حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے　　زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اس سے بڑھ کر کوئی کیا کہہ سکتا ہے:۔

وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا؟ کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال کی شاعری کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لئے شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام کی نظمیں غور سے پڑھنی چاہئیں۔ یہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی دوسری نظمیں اس پایہ کی نہیں ہیں۔ ان کی بعض چھوٹی نظمیں بہت پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مثلاً ایک آرزو، سرگزشت آدم، جگنو، چاند، صبح کا ستارہ، پرندہ اور جگنو وغیرہ بہت اچھی اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوق سخن ہے بآسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرز ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں مگر شان و شکوہ، زور اور شور امنڈتے ہیں۔ جذبات کی ادائی

انہ نظر اور شاعرانہ اندازِ بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں ۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ
ہے ۔ اولادِ ابراہیم ہے ۔ نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟
گویا ہزارہا سال کے تاریخی تجربوں کے نچوڑ کو دو مصرعوں میں پیش کر دیا ہے ۔
شاعروں نے بہار و خزاں کے سمئے اور گل و بلبل کے راز و نیاز بیان کئے ہیں
ں نے صحرا کا سماں لکھا ہے ۔ چند شعر ہیں مگر کس قدر بلند او کیفیت پیدا کرنے والے

رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
دِ اختر سیماب پا ہنگام صبح یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
وقت شام صحرا میں غروب آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل
ہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل
وبرانے کی سودائے محبت کو تلاش اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یا اس شعر کو دیکھئے ۔ کیا خیال ہے اور کیا قوتِ بیاں :-

ت ایک ہے ہر شئے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

میرا مقصد اس وقت اقبال کے منتخب اشعار کا پیش کرنا نہیں ہے اور
س کا موقع ہے اور نہ مسلسل نظموں میں سے بعض اشعار کا انتخاب مناسب ہے
اُن کے کلام کا لطف حاصل کرنا ہو وہ کم سے کم ان کی وہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں
ذکر میں اوپر کر چکا ہوں ۔

آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخر ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں بیشک پریم کا رس گھلا ہوا ہے۔ اس کی محبت عالمگیر ہے۔ وہ تمام کائنات کو اپنے آغوش محبت میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے۔ ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت گہرا اور بے تہاہ ہے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطمح نظر اگرچہ مقابلتاً محدود ہے مگر زیادہ قوی۔ زیادہ پرزور اور زیادہ شور انگیز ہے۔ ٹیگور کے ہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لئے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب و کیف کے ساتھ خود داری ہے اور یہاں وارفتگی و شیفتگی۔

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　　ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

لیکن اگر وہ ایک لحظہ کے لئے ذرا ٹھہر کر دیکھیں تو ہم انہیں ان کا "نیا شوالہ" دکھانا چاہتے ہیں جس کی قسمت میں تعمیر سے پہلے کھنڈر ہونا لکھا تھا۔ گو اقبال اس وقت ایک دوسری شاندار تعمیر میں مصروف ہیں لیکن ایک ذرا انہیں دھر آنا پڑیگا اور وہ ان کی شاعری کا تو ... ہوگا

مکاتیب امیر مینائی

نشی مفتی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم اس زمانے کے بہت اچھے اور مستند
ں سے تھے۔ بعض کے نزدیک وہ متاخرین میں سب سے بہتر شاعر خیال
تے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ
شاعری میں قدما کی یادگار تھے۔ پہلی بات پر ان کے خطوط اور دوسری پر
سلاح سخن شاہد ہے۔

ی صاحب مرحوم کے رشید اور عزیز شاگرد مولوی احسن اللہ خان صاحب
مدیر رسالہ قند پارسی و پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) نے بڑی تلاش اور
سے منشی صاحب مرحوم کے خطوط جمع کر کے پہلی بار سنہ ۱۹۱۰ء میں شایع
ب دوسرے بار یہ مجموعہ اضافے اور ترمیم کے ساتھ شایع کیا گیا ہے
ع میں حضرت امیر کے حالات وضع و اخلاق و عادات اور تصانیف
ن کا کسی قدر مفصل ذکر ہے۔ اس کے بعد چند خوش فکر تلامذہ کا ذکر
ے کلام کی وقتاً فوقتاً جو اصلاح کی ہے اس کے نمونے دیے ہیں بعض
ب مرحوم نے اصلاح کی وجہ بھی بتا دی ہے۔ یہ اصلاحیں پرلطف ہیں اور
ے حد تک بصیرت ہوتی ہے۔ یہ اصلاحیں صرف زبان کی حد تک

ہوتی ہیں۔ نفس شاعری سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی دیباچہ میں انھوں نے
امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جو بلاشبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی
توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہو سکتی۔ اسی میں داغ و امیر پر بھی محاکمہ فرمایا ہے
ان دونوں باکمال استادوں کی زندگی ہی میں دو جتھے بن گئے تھے اور اس کا چرچا
اب تک چلا آرہا ہے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ حضرت ثاقب اس سے بچتے۔ اس
تبصرے اور محاکمے کا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی۔ البتہ شکوہ
الفاظ۔ متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو
داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں قصائد
باشوکت و فر کہتے ہیں اور سخنور باسرمایہ۔ صاحب علم و فضل ہیں۔ داغ ان اوصاف سے
معرا ہیں۔

آخر عمر میں استاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی
صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب
ہوئے۔ تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی۔ واقعی
بات یہ ہے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن امیر کا تلمذ۔ اساتذۂ لکھنو
کی ہم بزمی۔ اہل لکھنؤ کے کلام کا پیش نظر رہنا۔ پھر لکھنو کی صحبت کا اثر یہ سب امور
مانع ترقی و کامیابی ہوئے۔ اگر وہ دلی میں پیدا ہوتے۔ دلی کے ارباب کمال کی

ہم پیشی میسر آتی ۔ اساتذہ دہلی کا کلام سامنے رہتا اور شاہجہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ہوتے ۔

"مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کو غزل کا جان اور اردو شاعری کی روح ، رواں کہنا سراسر انصاف ہے ۔ مذاق عام نے اس رنگ سے اپنے آپ کو خوب رنگا اور ہر طرف سے اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ۔

اعلیٰ جذبات اور خیالات سے استاد امیر کا کلام مالا مال ہے ۔ برخلاف اس کے ادنیٰ جذبات اور خیالات مرزا داغ کی شاعری کا سرمایہ ہے ۔ داغ نے عشق سے مراد ہوسناکی اور نفس پرستی لی ہے اس لئے ان کی شاعری میں جذبات عالیہ نہیں ہے ۔ جذبات عالیہ کا تعلق حسن و عشق سے ہے اور داغ کے اشعار خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی سے لبریز ہیں ۔ مرزا کی شاعری ادنیٰ ہے ۔ البتہ زبان ان کے مضمون کے لئے جان ہے ۔ زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ ان کی شراب کو دو آتشہ کر دیتی ہے ۔"

اس محاکمہ میں ایک بات یہ کہی ہے جو عام طور پر اکثر سخن سنج اصحاب فرمایا کرتے ہیں کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا ۔ اس کا جواب مولانا شبلی مرحوم نے بہت خوب دیا ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :-

اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر

بڑا شاعر ہوگا یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے
فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی۔ انوری اور نظامی کے مقابلے میں
جاہل تھا۔ تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں :۔
"کہ آراست زلف سخن چوں عروس"۔ جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر
ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"۔

اب رہے شاعری کے دوسرے کمال سو اس کی نسبت میری یہ عرض ہے کہ
اعلیٰ جذبات اور خیالات نہ امیر میں ہیں نہ داغ میں۔ سوز و گداز سے بھی دونوں کا
کلام خالی ہے۔ حضرت ثاقب نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اعلیٰ جذبات اور خیالات سے
استاد امیر کا کلام مالا مال ہے۔ یہ محض شکوہ الفاظ کا فریب اور لفظی ترکیبوں کی نمود ہے
اس میں بعض اوقات اچھے اچھے مبصروں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ البتہ زبان کی صفائی
محاورات کا بے تکلف استعمال۔ بیان کی شوخی اور طرز ادا کا بانکپن۔ یہ ایسی چیزیں
ہیں جو داغ کو اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

اس کے ساتھ فاضل مؤلف و مرتب نے داغ و امیر کا کلام بالمقابل دیا ہے
نظم کے انتخاب کے بعد امیر مرحوم کے نثر کے نمونے بھی دئے ہیں۔ یہ کل حالات اور
تبصرے وغیرہ ۱۰۶ صفحے پر آئے ہیں۔ اس کے بعد مکتوبات ہیں۔

خطوط جو بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو لکھے جاتے ہیں وہ لکھنے والے کے
خیالات و جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں اور جو باتیں ہمیں کاتب کے متعلق ان تحریروں میں

مل جاتی ہیں وہ اس کی تالیف و تصنیف میں نہیں ملتیں ۔ اس کی سیرت کا صحیح اندازہ اکثر ان خطوط سے ہوتا ہے ۔ ان میں وہ اوروں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اپنے سے باتیں کرتا ہے اور اس لئے حجاب اور راز دلی خیالات اور جذبات کے اظہار میں مانع نہیں ہوتے ۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کے بہت مایوسی ہوئی ۔ تقریباً تمام خطوط بے لطف، بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں ۔ ہم نے یہ خیال کر کے کہ ایک باکمال استاد کے خطوط ہیں اور اس میں کیسے کیسے جواہر ریزے ہوں گے اول سے آخر تک تمام خطوط پڑھے لیکن ان میں نہ تو زبان کا لطف ہے نہ طرز بیان کی کوئی خوبی ہے ۔ نہ کہیں ادبی نکات بیان فرماتے ہیں اور نہ کہیں شعر و سخن پر کوئی ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ جس سے واقعات و حالات زمانہ پر کسی پہلو سے روشنی پڑے ۔ ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلت فرصت کا شکوہ ہے یا پیام و سلام اور خیر و عافیت یا روزمرہ کی بہت معمولی باتیں ہیں ۔ بیان کرنے والے انہیں باتوں کو بعض اوقات اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر دل مزے لینے لگتا ہے مگر یہاں یہ بھی نہیں بعض خط ایسے ضرور ہیں کہ ان میں استفسار پر بعض الفاظ اور محاورات کی صحت اور غلطی پر بحث کی ہے لیکن وہ بھی معمولی باتیں ہیں ۔ کوئی بات ایسی نہیں جس میں کوئی خصوصیت یا جدت یا خاص تحقیق ہو ۔ لوگ اپنے بزرگوں اور استادوں کی ہر چیز کو مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں ۔ عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے ۔ تنقید

نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف اِدھر منہہ پھیر لیتا ہے۔ جو صاحب آئندہ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں انہیں بہت دیکھ بھال کے بعد ہاتھ ڈالنا چاہیئے اور ملک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے جو فضول اور بیکار ہوں۔

البتہ ان خطوط سے دو باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور ان سے منشی صاحب مرحوم کو دلی تعلق تھا اور بعض بعض شاگردوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی خوشی سے خوش ہوتے اور ان کے دکھ سے انہیں دکھ ہوتا۔ دوسرے امیر اللغات کی تالیف میں بڑا انہماک تھا۔ مگر افسوس کہ کافی امداد بہم نہ پہنچنے سے اس کی تکمیل کی حسرت ان کے دل میں رہ گئی۔

ان خطوط سے کہیں زیادہ مفید وہ حصہ ہے جو حضرت ثاقب نے ابتدا میں منشی صاحب مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کے تبصرہ وغیرہ پر لکھا ہے۔ اس سے ہمارے قدیم شعرا کے خیالات۔ ان کی صحبتوں شاگردوں سے ان کے تعلقات ان کی شاعری اور اصلاح کے طریقوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ رسمیں اور طریقے اب اُٹھتے جاتے ہیں اور آئندہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب ان چیزوں کی تلاش ہوگی۔

کتاب کے کل صفحے (۲۰۴) ہیں۔ کاغذ، لکھائی چھپائی بہت معمولی۔ دائرہ ادبیہ لکھنو سے دو روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔

مؤلفہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی۔ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ صفحات (۴۲۵)

قیمت چار روپے

مولوی عبد السلام صاحب ندوی ایک مدت سے اس کتاب کی تالیف میں
ِق تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کی پہلی جلد اب چھپ کر شایع ہو گئی ہے۔
ا سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کتاب کا نام شعر الہند کیوں رکھا ہے۔ اگر شعر
نعر العجم کے تتبع میں یہ نام رکھا گیا ہے تو خیر ورنہ موضوع کے لحاظ سے یہ نام
ںہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس میں اردو شاعری کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری
ن شاعری کا مطلق ذکر نہیں ہے۔

س کتاب میں فاضل مؤلف نے اردو شاعری کے چار دور قائم کئے ہیں اور
پر ایک باب لکھا ہے۔ پہلے باب میں اردو شاعری کا آغاز اور قدما کا دور ہے
ہ میں تین دور قائم کئے ہیں اور قدیم شعراء سے لیکر مصحفی و انشا اور ان کے
کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں متوسطین کا ذکر ہے۔ اس دور کو مؤلف نے
دو میں تقسیم کیا ہے اور ان میں شیخ ناسخ اور خواجہ آتش اساتذہ دہلی اور
ومن و غالب کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں [illegible] ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مؤلف کا موضوع کیا ہے
اور اس کتاب کے لکھنے سے ان کا کیا منشا ہے؟ شروع میں جو ایک مختصر سا دیباچہ
لکھا ہے اس میں تحریر فرمایا ہے "افسوس ہے کہ آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی
جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے اُن تمام انقلاب و تغیرات کو نمایاں
کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانوں
میں اردو کا کیا درجہ ہے؟" اگر اس کتاب کا یہ موضوع ہے تو ہمیں افسوس سے یہ
کہنا پڑتا ہے کہ مؤلف کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ شاعری کے انقلابات اور
تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو
شاعر سے اور اس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو
اس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دینا۔ اچھا شعر کسی کا
بھی ہو، مزہ دے جاتا ہے۔ لیکن جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو
ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اُس کے خصائل
اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں اور اُس کے بعد اس کے عہد کے واقعات و حالات
اور تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک کہ ان کا
تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور
اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ اس کتاب
میں اس کی جستجو بالکل نہیں کی گئی۔ ہمارے ہاں کے بعض اہل تحقیق اسے "واقعات

کھتوتی" فرماتے ہیں اور بعض اہل ذوق "تذاقی" تصور کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اپنے زمانے کے رواج کے مطابق شعر پڑھ کر مزے لینا نسبتاً آسان ہے لیکن تحقیق کا رستہ بہت دشوار اور کٹھن ہے۔ اگرچہ آج کل آب حیات (مولفہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم) کو نظر حقارت سے دیکھنا فیشن ہوگیا ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ تحقیق کی رو سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن ایک خوبی اس میں ایسی ہے جو ہمارے کسی تذکرے میں نہیں پائی جاتی ہے۔ آزاد نے ہر دور کو کچھ اس انداز سے دکھایا ہے کہ اُس زمانے کی سوسائٹی، اور اُن لوگوں کی معاشرت اور وضعداری کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور شاعر مشاعروں میں شعر پڑھتے۔ داد دیتے۔ باتیں کرتے اور چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب یہ سب چیزیں سامنے ہوتی ہیں تو کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور شعر و شاعری کا صحیح اندازہ کرنے میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔

"قابل مؤلف نے اردو شاعری کے آغاز پر صرف بارہ صفحے لکھے ہیں اور یہ بہت ناکافی اور تشنہ ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ سے مطلق بحث نہیں کی ہے۔ ابتدائی شاعری جو دکن کی شاعری ہے اس سے مؤلف ناواقف ہیں اور نہ اُس کا انہوں نے مطالعہ فرمایا ہے۔ اس لئے دوسروں کے اقوال جوں کے توں نقل کر دیئے ہیں اور اس لیے قیاس قائم کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔ مثلاً غواصی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ غواصی نے طوطی نامہ بخشی کو نظم کیا، جس کا ایک مصرع ہندی اور

اور ایک مصرع فارسی زبان میں تھا'' یہ صحیح نہیں ہے۔ غواصی کی مثنوی ہمارے پاس موجود اس میں کہیں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ یہ رائے انھوں نے میر حسن کے تذکرے کی اس عبارت سے قائم کی ہے۔ اور اسے نقل بھی کیا ہے۔

''غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود''طوطی نامہ بخشی را النظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور ریکیٹ کہانی''۔

لیکن اس عبارت سے کہیں یہ نہیں پایا جاتا کہ اس مثنوی کا ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع فارسی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کی زبان فارسی اور ہندی ملی جلی ہے، یعنے آدھی ہندی اور آدھی فارسی ہے۔ بامثال کے طور پر ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''خود سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ نے اس قدر ذخیرہ مہیا کر دیا تھا کہ تذکرۂ شعرائے دکن میں اس مجموعہ کو دیوان کے نام سے موسوم کیا ہے''۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان کے مجموعہ کو دیوان نہیں کہہ سکتے تاہم اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کا کلیات بالکل اسی طرح مرتب ہوا ہے جیسے آج کل کے کلیات اور دیوان مرتب ہوتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ سب سے پہلے ولی نے اپنا دیوان شعرائے ایران کی طرز پر ردیف وار مرتب کیا۔ غرض یہ کہ اردو کی ابتدائی اور قدیم شاعری کے متعلق بہت ہی کم معلومات اس کتاب میں ہیں اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دوسروں سے اور خاص کر تذکرۂ طبقۂ خضر سے

منقول ہے۔

قدما کا دوسرا دور جس میں اردو شاعری کی تجدید و اصلاح پر بحث کی ہے وہ بھی
بہت مختصر ہے یعنے صرف بارہ صفحے پر ہے۔ اگرچہ قابل مولف نے زبان کی تاریخ
ور تغیر و تبدل کے اسباب پر کہیں بحث نہیں کی لیکن اس امر کو خوبی سے بتایا ہے کہ
عرگوئی کی طرز اور زبان میں کس کس طرح تغیر ہوا اور کون کون سے الفاظ ترک ہوتے گئے
مارے ہاں زیادہ تر شاعری کے ظاہر سے بحث ہوتی ہے اور اس لیے الفاظ کے
رک و اختیار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں قدیم محاورات اور
فاظ میں جو تغیرات پیدا ہوئے۔ اُن کی ایک فہرست مولف نے صفیر بلگرامی کے
لرہٗ جلوہ خضر سے نقل کردی ہے۔ چونکہ خود تحقیق نہیں ہے اس لیے جو غلطی اصل
صنف سے ہوگئی ہے وہ ویسی ہی رہ گئی ہے۔ مثلاً نسدن کے معنے ہمیشہ لکھے
ں۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں۔ نس کے معنے
ت کے ہیں اور نس دن کے معنے شب و روز کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک
وسری جگہ ندان کے معنے ہمیشہ یا پرسے کے معنے الگ اور نپٹ کے معنے بہت
رانکوں کے معنے ایک بیان کے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ دوسری جگہ الفاظ کی ایک
ر فہرست دی ہے جس میں ایک طرف تو میر اور سودا کے زمانے کے الفاظ دیے
ں اور اُن کے مقابل اُس تبدیلی کو بتایا ہے جو ناسخ کے زمانے میں ان میں واقع
ہئی۔ یہ الفاظ اس طرح سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو مغالطہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم یہاں چند الفاظ نقل کرتے ہیں۔

لفظ وقت سودا	تبدیلی وقت ناسخ
انکھڑیاں میاں	انکھڑیاں میں
پون بھی	ہوا بھی
بغل بیچ	بغل میں
تجھ تیغ	تیری تیغ
دریا کا سا	دریا سا

پڑھنے والے کو اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ انکھڑیاں کے ساتھ میاں، بھی کے ساتھ پون، بغل کے ساتھ بیچ، تیغ کے ساتھ تجھ، اور دریا کے ساتھ کا سا کا استعمال، ناسخ کے وقت میں موقوف ہو گیا مگر دوسرے لفظوں کے ساتھ استعمال ہوتا رہا۔ حالانکہ منشا یہ نہیں ہے بلکہ بتانا یہ ہے کہ پون کی جگہ ہوا، میاں کی جگہ میں، کا سا کی جگہ سا استعمال ہونے لگا۔ اسی فہرست میں بعض الفاظ ایسے بھی دیئے ہیں جن کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ناسخ کے وقت میں ان میں تبدیلی ہو گئی حالانکہ وہ اس کے بعد بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں مثلاً سمندر بلونا کے بجائے سمندر اولیچنا۔ بلونا اور اولیچنا کے معنوں میں بہت فرق ہے اور بلونا کی جگہ اولیچنا نہیں آسکتا اور اس لیے یہ تبدیلی صحیح نہیں ہو سکتی اسی طرح تجھ بن، کڈھب چھوڑ (''چھوڑ کر'' کی جگہ) اس ڈھب کا، وغیرہ ایسے الفاظ جو ناسخ کے بعد بھی

استعمال ہوتے رہے اور اب بھی مستعمل ہیں۔ "ایکوں" کی بجائے محاورۂ وقت ناسخ "ایک" لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے "ایکوں" ایک کی جمع ہے اور یہ میر اور اس سے قبل کے زمانے میں بلا تکلف استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ متروک ہو گیا لیکن یہ کہنا کہ اس کی بجائے "ایک" استعمال ہونے لگا درست نہیں، کیوں کہ اس کے معنے کبھی ایک کے نہ تھے بلکہ اس کے معنے "بعض" یا "کئی" کے ہوتے تھے۔ ایک پہلے بھی استعمال ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے اسی فہرست میں یہ بھی لکھا ہے کہ "نہیں معلوم مجھ پر بھی" میر حسن کے وقت کا محاورہ ہے اور اس کی بجائے ناسخ کے وقت کا محاورہ "نہیں معلوم مجھ کو بھی" ہو گیا۔ ہم اس کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ یا مثلاً لکھا ہے کہ شاہ نصیر کے وقت میں "گھٹائیں چھائیاں" بولتے تھے اور ناسخ کے وقت میں "گھٹائیں چھائیں" بولنے لگے۔ یہ طریقہ لکھنے کا درست نہیں کیوں کہ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ فعل کی یہ تبدیلی صرف گھٹاؤں کے ساتھ ہوئی۔ حالانکہ مقصود یہ ہے کہ مؤنث جمع کے ساتھ فعل کا جمع لانا متروک ہو گیا اور جمع کے ساتھ بھی فعل واحد ہی استعمال ہونے لگا۔ یہ فہرست بھی مؤلف نے تمام تر جلوۂ خضر سے نقل کر کے لکھی ہے۔

مؤلف کو اس موقع پر متروکات پر بحث کرنے کا بہت اچھا موقع تھا مگر افسوس انہوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا اور صرف جلوۂ خضر کی رائے کا بیان کر دینا

کافی سمجھا جو محققانہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس معاملہ میں اکثر اصحاب کو مغالطہ ہوا ہے جو صاحب اس سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اردو کے پچھلے پرچہ میں جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کا مضمون مطالعہ فرمائیں جو بڑی تحقیق اور غور سے لکھا گیا ہے۔ لیکن قابل مؤلف نے آخر میں نہایت انصاف کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا ہے "کہ شیخ ناسخ نے قدما کی بعض ایسی ترکیبیں اور بعض ایسے الفاظ بھی متروک قرار دئے جن کا وہ بزعم البدل کیا' بدل بھی پیدا نہ کر سکے۔"

میر کے قصائد کی نسبت اگرچہ انہوں نے یہ رائے دی ہے کہ "قصائد میں اُن کا درجہ بے شبہ پست نظر آتا ہے" لیکن اُس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان کے قصائد سے بھی سرسری طور پر گذر جانا مناسب نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُس زمانہ میں جو چیزیں قصیدہ گوئی کا معیار کمال خیال کی جاتی تھیں، اُن سے ان کے قصائد بالکل خالی ہیں، انہوں نے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا، دھوم دھام کی تشبیہیں نہیں لکھی ہیں، طولانی قصائد بھی اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے، اُن کے یہاں عموماً الفاظ کی شان و شوکت بھی موجود نہیں، قصائد میں اُن کی بندشیں بھی چست نہیں ہوتیں، لیکن بااین ہمہ تشبیہات میں جو سادگی اور لطافت سودا کے یہاں پائی جاتی ہے وہ ہی میر صاحب کے قصائد میں بھی موجود ہے" اس رائے کے بعد مؤلف نے دونوں اُستادوں کے ایک آدھ قصائد کے بعض اشعار کا مقابلہ کر کے اپنے قول کی تصدیق فرمائی ہے۔

ے نہایت درست ہے اور جو شخص بھی ان قصائد کو غور سے پڑھے گا وہ آن
ق کرے گا ۔

فاضل مؤلف نے "اردو شاعری کے دو مختلف اسکول دلی اور لکھنؤ" پر
ے تفصیل سے بحث کی ہے ۔ اس تفصیل سے اب تک کسی تذکرہ نویس یا مولف
بحث نہیں کی تھی ہم نے دریائے لطافت کے مقدمہ میں کنایتاً اور انتخاب
م میر کے مقدمہ میں سرسری طور پر لکھنؤ کی شاعری کے متعلق ذکر کیا تھا تو وہاں کے
ں ممتاز اہل قلم بہت برہم ہوئے اور اس کی تردید میں کئی مضامین شایع ہوئے
وم نہیں اس کتاب کے شایع ہونے کے بعد بیچارے مولوی عبدالسلام صاحب
ا حال ہو گا ۔ ہم اُن کی رائے کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں ۔

١ ۔ لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ پن پایا جاتا ہے اس کا
ہاں کی شاعری سے بھی واضح ہوتا ہے ۔

٢ ۔ شعرائے دہلی کے کلام میں فارسی زبان کی دلاویز ترکیبیں نہایت کثرت سے
جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قدما کی روش کو بہت کچھ قائم
ا ہے لیکن شعرائے لکھنؤ کا کلام ان ترکیبوں سے بالکل خالی ہے ۔

٣ ۔ شعرائے دہلی قدما کی طرز پر اکثر مختصر غزلیں کہتے ہیں اس لئے ان کے ہاں
ل سخیف اور بھرتی کے اشعار بہت کم ہوتے ہیں لیکن شعرائے لکھنؤ اکثر
یت سیر حاصل غزلیں لکھتے ہیں جن کی انتہا بسا اوقات دو غزلہ ، سہ غزلہ

اور جو غزل پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام قافیوں کو خواہ مخواہ باندھنا
اور اس طرح بہت سے مبتذل مضامین پیدا ہو جاتے ہیں۔ شعرائے لکھنو کے یہاں
بے اثر اور بے کیف اشعار کا جو انبار نظر آتا ہے، اس کا ایک سبب یہی سلسلہ
۴۔ شعرائے لکھنو اور شعرائے دہلی کے کلام میں معنوی طور پر جو چیز ما بہ الامتیاز
وہ یہ ہے کہ شعرائے لکھنو کے کلام میں روحانی جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں
اُن کی جگہ معشوق کے خارجی اوصاف و لوازم مثلاً زلف و کاکل، خط و خال
انگیا، کوئی اور مجرم وغیرہ کا ذکر اس کثرت سے آتا ہے کہ اُن کے کلام کو پڑھ کر
تغزل کا لطف بہت کم حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ رعایت لفظی کی طرف شعرائے لکھنو کا عام میلان پایا جاتا ہے، اور اس
صنعت کو وہ نہایت ابتذال کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ ابتذال بھی شعرائے لکھنو، کی ایک عام خصوصیت ہے۔

۷۔ شعرائے لکھنو کا عام رنگ معاملہ بندی ہے، جس نے حد اعتدال سے
بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ہے، اس لئے اُن کے کلام میں وہ متانت و
ثقاہت نہیں پائی جاتی جو شعرائے دہلی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

ان عنوانات کے تحت میں مؤلف نے مثالوں کی کافی تعداد دی ہے۔ خیر ہم پر
تو یہ الزام تھا کہ ہم دلی کی طرف کے رہنے والے ہیں، لیکن مولوی عبدالسلام صاحب
نہ لکھنؤ کے ہیں اور نہ دلی کی طرف کے، دیکھیں اُن پر کیا الزام لگایا جاتا ہے۔

متاخرین کے باب میں مؤلف نے داغ و امیر کا الگ عنوان قائم کیا ہے، جس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "موازنہ و مقابلہ کے لئے اشتراک ایک لازمی چیز ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو لوگ باہم حریف و مقابل تسلیم کئے گئے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کی مشارکت نہیں پائی جاتی"۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "منشی صاحب مرحوم کا ابتدائی کلام جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں لکھنو کے قدیم مبتذل رنگ میں ہے، اس لئے اِس رنگ کی تمام امتیازی خصوصیات اس میں موجود ہیں"۔ پھر مولف نے اس کی تصریح کی ہے اور مثالیں دیکر بتایا ہے کہ ان میں رعایت لفظی، ابتذال، تمثیل، معشوق کے تمام خارجی اوصاف اور لوازم کی تعریف و توصیف وغیرہ پائی جاتی ہے۔ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ "منشی صاحب کا قدیم کلام بلکہ جدید کلام بھی لکھنؤ کے رنگ سے الگ نہیں"۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ "میر، درد اور آتش کے رنگ میں بعض غزلیں اور بعض اشعار اُن کے قلم سے نکل گئے ہیں جن کو ان کے عمر بھر کے شاعرانہ گناہ کا کفارہ سمجھنا چاہیئے"۔

آخری یعنی چوتھا باب "دورِ جدید" پر ہے۔ اِس باب کے شروع میں مؤلف نے اُن چند اصلاحی مطالبات کا مختصر ذکر کیا ہے جو جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعراء کے سامنے پیش کئے ہیں۔ لیکن جدید دور کی شاعری کے اسباب پر بحث نہیں کی اس کے بعد جدید دور کے مصلح مولانا حالی کے مقدمۂ شاعری سے اُن کے اصلاحی خیالات نقل فرمائے ہیں۔ اس کے خاتمے پر مولانا حالی کی غزلیات

مختصر سی بحث کی ہے اس کے بعد مولانا حسرت موہانی، مولوی شوکت علی خاں فانی، مولانا محمد علی جوہر، اصغر حسین صاحب اصغر، مولانا علی محمد شاد، عزیز لکھنوی، شبیر حسن جوش، کی شاعری کے متعلق دو چار سطروں میں ہر ایک کی خصوصیت بتا کر مثال کے طور پر اُن کے اشعار نقل کر دئے ہیں۔ اس کے بعد وطنی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، مناظر قدرت، نیچرل شاعری اور قومی شاعری کا سرسری ذکر کیا ہے۔ ان سب اصناف کی ابتدا مولانا حالی سے ہوئی اور دوسروں نے اس کا اتباع کیا۔ مؤلف نے ان سب اصناف کا بیر ظریفانہ شاعری اور تاریخی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے تحت میں نہایت مختصر طور پر بعض قدیم و جدید شعرا کے اشعار بھی دیدئے ہیں۔ اور اسی ضمن میں دو ایک جگہ بعض اُن جدید نظموں کی فہرست دیدی ہے جو آج کل ان عنوانات پر شایع ہوئی ہیں۔ آخر میں ایک فہرست متفرق نظموں کی ہے جس میں دور جدید کے چھوٹے بڑے بہت سے شاعروں کے نام آجاتے ہیں، اگرچہ بعض اچھے کہنے والے شاعروں کے نام رہ گئے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ یہ دور ابھی بن رہا ہے اور سب شاعروں سے واقف ہونا مشکل ہے۔ ہمیں اس باب میں جن بحثوں کی توقع تھی وہ نہیں پائی جاتیں اور اس لئے یہ ناکافی ناتمام اور تشنہ ہے۔ دور جدید میں جن اثرات اور اسباب نے ہماری شاعری میں انقلاب پیدا کیا ہے اُن پر بحث نہیں کی گئی جو بہت ضروری تھی اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس باب کو ناکافی اور نامکمل کہتے ہیں۔ اور

سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ نظیر کا ذکر اس کتاب میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ ایک جگہ ضمنی طور پر اس کا نام آگیا ہے۔ لائق مؤلف نے جہاں مناظر قدرت کا عنوان قائم کیا ہے وہاں صرف اتنا لکھا ہے "لیکن یہ صنف اس دور کی مخصوص پیداوار نہیں ہے بلکہ نظیر اکبرآبادی نے اردو زبان میں اس کے متعدد نمونے قائم کئے ہیں۔ اور اس کے بعد نظیر کی برسات سے چند بند نقل کر دئے ہیں اور بس۔ ہم اسے ناانصافی خیال کرتے ہیں نظیر خالص ہندوستانی شاعر ہے اور خاص حیثیت رکھتا ہے اور شعر الہند میں خاص تذکرے کا مستحق تھا۔

مؤلف نے اپنی کتاب میں شعر سے بحث کی ہے اور شاعر اور اس کے عہد کو چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے یہ کتاب ہر جگہ تشنہ نظر آتی ہے۔ شعر اور الفاظ و محاورات کے تغیر و تبدل کے متعلق بھی بہت کچھ جلوۂ خضر مؤلفہ صفیر بلگرامی سے ماخوذ ہے اور اس بنا پر اگر اُسے جلوۂ خضر کا مد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

روحِ تنقید

از ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زور۔ بی اے
چھوٹی تقطیع صفحات تخمیناً (۳۰۰) قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے
مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ مؤلف۔ نظامت منزل، کنگ کوٹھی روڈ
یا مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

تنقید جس قدر عام ہے اسی قدر مشکل ہے۔ جس طرح یہ ہمیشہ سے چلی آئی ہے اسی طرح ہمیشہ تک چلی جائے گی۔ اس کے مختلف مذاہب اور فرقے اور اس کے متعلق مختلف خیالات اور متضاد رائیں ہیں۔ اور یہ سب چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں اور پڑھنے والا یہ رائے مشکل سے قائم کرسکتا ہے کہ تنقید کیا ہے۔ وہ مختلف اور متضاد رائوں کو پڑھ کر الجھن میں پڑجاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔

تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کرسکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دوربیں ہو۔ جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو۔ جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کرسکتا ہے۔ ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا

حالی مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وہ اس کے بانی ہی نہیں بلکہ ایک
اعلیٰ پایہ کے ادبی نقاد ہیں اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی
جائیں گی۔ یہ کتاب (روح تنقید) تنقید پر نہیں بلکہ تنقید کے متعلق ہے، اس میں
اس کے باطن سے نہیں بلکہ اس کے ظاہر سے، اس کی روح سے نہیں بلکہ اس کے
جسم سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے
چند پروفیسروں کے لکچروں اور نوٹوں اور انگریزی تصانیف سے لے کر مرتب
کیا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ترتیب اور تحریر میں بہت سلیقے سے
کام لیا ہے اور غیر ملک کے مضمون اور غیر زبان کے خیالات کو اپنی زبان میں
خوبی سے ادا کیا ہے۔

بجز دیباچہ کے چند صفحوں کے جن میں چند اردو تنقید نگاروں کا سرسری ذکر ہے
باقی تمام کتاب میں یورپ کی تنقیدی تاریخ اور تنقیدی ارتقا سے بحث کی گئی ہے
مؤلف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ مبادی تنقید سے ہے
اس میں تنقید کی تعریف، ادب کی تعریف، ادب کی پیدائش، ادب کی تقسیم،
ادب کا مقصد، تنقید کا مقصد، تنقید نگار کے فرائض، تنقید نگار کی نگہداشت
اصول تنقید کے عنوان ہیں۔ دوسرے حصے میں تنقید کی تاریخ ہے جس میں ازمنۂ
قدیمہ یونان و روما، ازمنۂ متوسط، عصر اصلاح، ارتقائے تنقید (فرانس، انگلستان
...ویں صدی کے بعد کی تنقید، تین مشہور نقاد، مروجہ تنقید اور چند تنقید نگاروں کے کارنامے

باب ہیں ۔ مروجہ تنقید پر تقریباً چار صفحے ہیں اور ان میں بعض مشہور مصنفین اور شعرا کے مقولے درج ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق مؤلف نے تنقید پر انگریزی کی اکثر و بیشتر کتابیں مطالعہ کی ہیں یا ان کے متعلق دوسرے مصنفین کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن یہ دیکھ کر ہمیں سخت تعجب ہوا کہ کتاب بھر میں اٹلی کے نامور فاضل اور نقاد کروچے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس نے ادب و فنون لطیفہ کی موجودہ و مروجہ تنقید میں بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی بلکہ اعلیٰ درجے کا کلام اور اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ لائق مؤلف نے اس خیال سے کہ کوئی یہ الزام نہ دے کہ فن تنقید پر تو سب کچھ لکھ ڈالا، لیکن مثال کے طور پر کوئی تنقید نہ لکھی، مثنوی میر حسن پر ایک تنقید لکھی ہے اور یہ بہت اچھا کام کیا ہے مگر اس میں نکتے کی باتیں تقریباً سب وہی ہیں جو مولانا حالی اپنے مقدمہ دیوان میں بیان کر چکے ہیں۔ کتاب میں بہت سے ایسے امور اور مسائل ہیں جن پر بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے لیکن چونکہ ان کا تعلق مؤلف سے نہیں بلکہ مؤلف ان کے ناقل ہیں، اس لئے ان پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔

کہیں کہیں املا، زبان اور واقعات کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً "سخن گو اور سخن سنج ہستیوں کے آگے زانوئے ادب طے کیا" (ص ۲۲، ۱۱۲، ۱۲۳، ۲۰۵) یہ لفظ "طے" نہیں بلکہ "تہ" ہے۔ یہ غلطی متعدد مقامات پر نظر آئی۔

وہ سمندر کی گہرائیوں میں کود پڑیں اور گراں بہا موتیاں حاصل کرنے کی
کریں" (ص ۱۱۱) یہاں "موتیاں" اردو کے محاورے کے رو سے غلط ہے
خاتمہ صرف ٹریجڈی یا حزنیہ کو چھوڑ کر اس قدر دل خوش کن ہونا چاہیے کہ
ثیت کے اس عالمگیر اور مستقل جذبہ کو امتنان اور اطمینان بخش سکے...
...... (صفحہ ۱۱۹) یہاں امتنان کا کوئی موقع نہیں معلوم ہوتا۔
نہریں فاض، قرقرے، مرغابیاں......" (صفحہ ۱۶۰) دل لگی میں قاضی
ں مادہ کہا کرتے ہیں شاید اسی دھوکے میں قاز کا املا اس طرح لکھا گیا ہے
بہلی حیرت جہالت کی اولاد تھی اور آخری حیرت عظمت کی والدین" (۲۶۲)
کا لفظ یہاں عجیب طرح استعمال ہوا ہے۔
رسطو کی پیدائش مسیح سے ۳۸۴ سال قبل مسیح اور افلاطون کی ۴۲۷ سال
ح لکھی ہے (ص ۱۶۷) اور اسی لحاظ سے لائق مؤلف نے ترتیب میں ارسطو کو
ر افلاطون کو اس کے بعد رکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ افلاطون ارسطو سے
ہے اور اس کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال قبل ہے۔
پروفیسر حافظ محمود خان اختر شیرانی" (۵۲۷) اس نام میں اختر کا اضافہ صحیح
ہے۔ اختر، پروفیسر محمود کے فرزند کا تخلص ہے۔
ولف نے یورپی مصنفین اور نقادوں کی رائوں اور تنقید کے ارتقا اور
س خوبی سے اپنی زبان میں لکھا ہے وہ قابل داد ہے اور جامعہ عثمانیہ کے

ایک لائق طالب علم ہی سے اس کی توقع ہو سکتی ہے۔ یہ وہ برتری ہے جو دوسرے کالجوں کے طلبہ کو کم نصیب ہوتی ہے۔ ہم مولف کے ساتھ اُن کے فاضل پروفیسر و مسٹر سپیٹ اور مولانا وحید الدین سلیم کو بھی مبارکباد دیتے ہیں جن کے لکچروں کی جھلک کتاب میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

اصلاحِ سخن

مرتبہ جناب محمد عبد العلی صاحب شوق سندیلوی۔ صفحات ۲۳۰

عنوان سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے، لیکن اصلاحیں جس ڈھب سے
حاصل کی گئی ہیں وہ عجیب و غریب ہے اور قابل مرتب کی جدت طبع پر دلالت
کرتا ہے۔ ہماری شاعری میں اساتذہ کی اصلاحیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی
جاتی ہیں اور بعض اصلاحیں جو قدیم استادوں کی دستیاب ہوئی ہیں یا مشہور
چلی آتی ہیں وہ بڑی آب و تاب اور فخر کے ساتھ تذکروں یا اسی قسم کی دوسری
تالیفات میں درج کی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے عنایت فرما جناب صفدر
مرزاپوری نے بھی ایک کتاب اسی مضمون کی شایع کی تھی، مگر اس میں اور اس میں
فرق ہے۔ وہ قدیم اساتذہ کی اصلاحیں تھیں اور یہ ہم عصر شعرا کی ہیں۔ ان اصلاحوں
کے بہم پہنچانے میں جناب شوق نے بڑی ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ حضرت نے
ایک ہی غزل ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مشہور شعرا کی خدمت میں بھیجی
اور شاگردی کے ادعا کے ساتھ اصلاح کی درخواست کی۔ بعض کی خدمت
میں تو باقاعدہ شیرینی کے دام پیش کر کے شاگردی کی رسم ادا کی ہے۔ ان بزرگوں نے
حسب معمول شاگرد سمجھ کر غزل میں اپنے فہم کے موافق اصلاح دی اور از راہ استادی

کچھ کچھ ہدایتیں بھی کیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی سولہ غزلوں کو جن پر کم و بیش ۲۵ نامور
اور مستند شعرا کی اصلاحیں ہیں۔ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ کوئی
پانچ سال تک رہا۔ ایک اقبال اور اکبر مرحوم تو ان کے دام میں نہیں آئے، باقی کوئی
ان کی زد سے نہیں بچا۔ بعض نے دبی زبان سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر حضرت شوق کب
مانتے ہیں، سر ہو گئے، شاگرد ہو کے رہے، اصلاح لے کے چھوڑی۔ بعض حضرات کو
جب اس کی سن گن معلوم ہوئی کہ ان کی اصلاحی غزلیں دوسری جگہ بھی اسی غرض سے
گئی ہیں تو انہیں شبہ ہوا اور حضرت شوق سے دریافت کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق
صاحب نے کچھ ایسی تھپکی دی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ استادی کا شوق بھی برا ہوتا ہے
جل میں آگئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے۔ انہیں اصلاحوں کی یہ پوٹ ہے جو
چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

ترتیب کتاب کی یہ ہے کہ پہلے جلی قلم سے اپنی پوری غزل لکھ دی ہے۔ اس کے
بعد ہر صفحہ کے شروع میں اپنا ایک ایک شعر جلی قلم سے لکھا ہے اور حاشیے پر اساتذہ کے
نام لکھے ہیں اور صفحے کے متن میں اصلاح نقل کر دی ہے، جس شعر پر کسی استاد نے کچھ
ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اصلاح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ جن حضرات نے جن اشعار پر
صاد بنایا ہے وہاں (ص) بنا کر ان کے تخلص لکھ دئے ہیں اور جن حضرات نے
شعر میں کوئی ترمیم نہیں کی، ان کے نام ہر صفحے کے آخر میں لکھے ہیں اور کوئی نشان نہیں
بنایا ہے۔ اگر کسی استاد نے کمال شفقت سے اسی زمین میں کچھ اشعار نذر کئے ہیں تو

وہ بھی نام کی صراحت کے ساتھ نقل کر دئے ہیں۔

اس مجموعے کو دیکھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ ہنسی تو حضرت شوق کی شوخی پر آئی اور افسوس ان بزرگوں کی سادگی پر ہوا۔ خیر اس کا بھی کچھ مضائقہ نہ تھا کہ وہ یہ سب اصلاحیں چھاپ دیتے، لیکن غضب یہ کیا کہ کتاب کے آخر میں ان صاحبوں کے وہ تمام خطوط بھی شایع کر دئے ہیں جو انہوں نے زمانۂ اصلاح میں اپنے سعادت مند شاگرد کو لکھے تھے۔ ان سادہ دل بزرگوں نے شاگرد سمجھ کر کمال بے تکلفی اور سادگی سے جو جی میں آیا لکھ دیا ہے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ایک صاحب شاگردی کی مٹھائی مانگ رہے ہیں، دوسرے اپنے دیوان کے مصارف کے لئے چندے کا اصرار فرما رہے ہیں، تیسرے صاحب نے شاگردی کی مٹھائی کے ساتھ استاد کی خدمت کا بھی صاف صاف اشارہ کیا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جواب کے لئے آدھ آنے کا ٹکٹ جو بھیجا ہے تو کیا اب سند لینے میں لڈو نہیں بنتے؟ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے میں پھوڑے گا۔ غرض حضرت شوق نے اپنے "اساتذۂ کرام" کا نام اچھالنے اور اُن کی رسوائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جناب شوق اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "اس درمیان میں (یعنے زمانۂ اصلاح) اساتذہ کے جو خطوط نکات ادبیہ کا گنجینہ نظر آئے وہ بھی ضمیمے کے طور پر آخر کتاب میں درج کر دئے گئے ہیں۔ اگر کسی استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گذرے تو مجھے معاف کریں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافت طبع

ارباب ذوق کے لئے کیا ہے اور اساتذۂ معتبرہ کے فیوض عام کرنے کے لئے "
اول تو یہ خط نکات ادبیہ کا ایسا گنجینہ نہیں جیسا کہ حضرت شوق فرماتے ہیں اور اگر
کچھ ادبی بحث سے بھی تو چاہیئے تھا کہ وہی خط چھاپتے جس کا تعلق ادب سے ہے
غیر متعلق خطوط یا خطوط کے ایسے حصوں کے چھاپنے سے جن میں کوئی ادبی بحث نہیں۔
ان کا کیا مقصد ہے؟ شاید "ضیافت طبع ارباب ذوق" مدنظر ہو۔ طبع کے بعد
معافی مانگنا یہ اور ستم ہے۔ ہمارے خیال میں اُن کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی
خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے۔ مگر شاگرد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے، اُسے اجازت
کی کیا ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ جب یہ سفینۂ زرین حضرات اساتذہ کی خدمت میں پہنچے گا تو بہت
جھنجھلائیں گے، بگڑیں گے، خفا ہوں گے، مگر اس سے کیا حاصل؟ جو ہونا تھا سو
ہوگیا۔ مصلحت یہ ہے کہ اب خاموش رہیں اور اس سے عبرت حاصل کریں اور
شاگردوں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوں۔

اب رہی اصلاح، جس کے مفید ہونے پر بڑا طومار باندھا گیا ہے، سو واقعی اچھی
ہی واہی ہے۔ بعض صاحبوں نے اصلاح کے شوق میں سرے سے مضمون ہی بدل دیا ہے
کوئی صاحب مطلب نہیں سمجھے اور شعر کاٹ کے رکھ دیا ہے۔ کسی نے اصلاح دے کر
شعر کو پست کر دیا ہے اور کہیں مضمون ہی خبط ہو گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں کوئی اصلاح
اچھی بھی نظر آجاتی ہے۔ خیر جو صاحب بصیرت ہیں وہ تو ان اصلاحوں کو دیکھ کر ان کی

حقیقت سمجھ لیں گے، لیکن جو مبتدی ہیں یا جنہیں شعر کہنے کا نیا نیا شوق ہوا ہے انہیں بڑی الجھن پیدا ہوگی اور کچھ تعجب نہیں کہ وہ اصلاحوں کے اس طومار سے گم راہ ہو جائیں جہاں حضرت شوق نے اتنا کھڑاگ کیا تھا، اگر وہ ہر شعر کی اصلاحوں پر ایک مختصر سا محاکمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیتے تو بہت اچھا ہوتا اور اس حالت میں یہ کتاب کچھ نہ کچھ ضرور مفید ہو جاتی ۔

اس کتاب میں ایک دوسری جدت یہ ہے کہ حضرت نیاز فتح پوری صاحب نے تو شروع میں کتاب کی تقریب لکھی ہے، دیباچہ ہمارے محترم مولانا شرر مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے، مقدمہ جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے لکھا ہے، تبصرے جناب امیر احمد صاحب علوی اور ہمارے شفیق مکرم جناب ڈاکٹر صدیقی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سب تحریریں سنجیدہ اور بڑی شان کی ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

ہم بھی جناب شوق کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ادبی تفریح کا ایسا اچھا سامان جمع کیا ہے جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا اور جو محنت اور کاوش انھوں نے اس میں اٹھائی ہے وہ فی الحقیقت قابل داد ہے ۔

اردو شہ پارے

جلد اول

مرتبۂ ڈاکٹر سید محی الدین قادری، ایم اے پی ایچ ڈی
مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مکتبہ ابراہیمیہ نے اردو کلام کے انتخابات شایع کرنے کی تجویز کی ہے۔ جو بہت اچھا کام ہے۔ اس کی پہلی جلد شایع ہو چکی ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور نثر نگاروں کا کلام انتخاب کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مصنفین کے حالات بھی درج ہیں۔

پہلے باب میں اردو ادب کی ابتدائی کرشموں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بیجاپور، تیسرے میں گولکنڈہ اور چوتھے میں مغلوں کی حکومت کے شعرا او نثر نگاروں کا ذکر ہے۔ اڈنبرا کی بیاض سے بعض مرثیہ گو شعرا کا کلام بھی انتخاب کیا گیا ہے۔
کتاب کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ کتاب کے آخر میں آٹھ ضمیمے اور ایک فرہنگ ہے۔ ضمیموں میں ہر باب کے مصنفین اور کتابوں کی فہرست مع سنین ہے۔ ایک

ضمیمے میں الٹو تبرا کے بیاض کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اور اُن کے مرثیوں کی تعداد ہے ۔ ایک ضمیمہ سنین کا ہے ۔ سب سے آخر میں اُن مشکل الفاظ کی فہرست ہے، جو ان انتخابات میں آئے ہیں ۔ علاوہ اس کے سات شاعروں کی تصویریں اور بیاضِ سلطان محمد قلی قطب شاہ میں سے چار قطعوں کے چربے بھی دیے ہیں جن سے کتاب کی رونق بڑھ گئی ہے ۔

اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہے جو مؤلف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہے ۔ یعنی عجلت ۔ بعض نوجوان انشا پردازوں کو مصنف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ ان کے کاموں میں ایسی قابلِ افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں جو صرف محنت اور غور کرنے ہی سے رفع ہو سکتی ہیں ۔ یہ نکتہ ہر نوجوان انشا پرداز کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔ چنانچہ اس قسم کی خامیاں جو عجلت اور پریشانی کا نتیجہ ہیں اس کتاب کے دیکھنے پر نظر آتی ہیں ۔

یہ خامیاں کئی قسم کی ہیں ۔

اول :۔ ایسے الفاظ جو درحقیقت مشکل اور اجنبی ہیں فرہنگ میں نہیں ہیں ۔ مثلاً بھیدنا، سانت، نگکن، دلکھ، تبلی، لبدنا، ابھال، پارک (پارکھ) وغیرہ وغیرہ فرہنگ میں نظر نہیں آتے ۔

دوم :۔ جس کلام کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کے پڑھنے میں محنت اور غور نہیں کیا گیا اور جیسا غلط سلط لکھا ہوا تھا ویسا ہی نقل کر دیا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر

یہ مصرع۔

جیوں پھول نازاں بن منے جیوں پوتلی بوچن منے

بے معنی ہے۔ یہ لفظ بوچن نہیں بلکہ لوچن ہے۔ "پوتلی" پتلی ہے۔ لوچن کے معنی آنکھ کے ہیں۔ یعنی آنکھ کی پتلی۔ اسی طرح دوسرا مصرع۔

دندی تیری شہرت سے بورے ہے اہیں

ہے۔ اس کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ یہ لفظ "بورہے" نہیں بلکہ بوڑے ہے۔ بوڑے کے معنی دکنی زبان میں بہرے کے ہیں۔ اس قسم کے شعر کثرت سے ہیں جو غلط نقل کر دیے گئے ہیں اور پھر حاشیے میں نہ تو ان کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے اور نہ یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی صحت نہیں ہو سکتی۔ انتخابات کی کتابیں بہت قابل قدر ہوتی ہیں اور اس لئے ان کی صحت کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے انتخابات جن میں غلط اور صحیح کی کوئی تمیز نہ ہو محض بیکار ہیں۔ خاص کر ایسے کلام کے انتخاب میں جو قدیم ہے اور ایسی زبان میں ہے جو اب عام طور پر نہیں بولی جاتی۔ اس کی صحت کامل توجہ اور غور سے ہونی چاہیئے۔

سوم:۔ اکثر الفاظ کے معنی غلط دئے ہیں اور محض قیاس سے لکھ دیے گئے ہیں۔ مثلاً ادھار کے معنی غذا اور خوراک دیے گئے ہیں جو صحیح نہیں۔ وہ لفظ اہار ہے۔ ادھار کے معنی بھروسے اور اعتماد کے ہیں۔ اسی طرح اپنگ کو اپنک لکھا ہے اور اس کے معنی بہت بنائے ہیں جو بالکل غلط ہیں۔ "بارا" کے معنی

سردی کے لکھے ہیں۔ حالانکہ اس کے معنے ہوا کے ہیں۔ "درماں" کے معنے تعظیم لکھے ہیں۔ حالانکہ یہ دو لفظوں سے مرکب ہے اور مان بمعنے وان ہے یعنے عزت والا "رہس" کے معنے شوق اور امنگ کے لکھے ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ کبھی استعمال نہیں ہوا۔ اصل میں یہ لفظ امس ہے کسی غلط نسخے میں رہس لکھا ہوگا ویسے ہی نقل کر دیا گیا۔ "سکن" کے معنے بری گھڑی کے دیئے ہیں اور تشریح یہ کی ہے کہ "سو" بمعنی بری اور گن بمعنی گھڑی یعنے بری گھڑی۔ یہ لفظ دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک تو شگون کے معنوں میں اور دوسرے گنوان یعنی خوبیوں والے کے معنوں میں "سو" الفاظ کے شروع میں بطور سابقہ کے ہمیشہ اچھے معنوں میں آتا ہے جیسے سگند سگھڑ وغیرہ۔ غرض اس قسم کے بیسیوں لفظ ہیں جن کے معنے یا تو غلط لکھ دیے گئے ہیں یا اُن کے پڑھنے میں غلطی کی گئی ہے اور لفظ کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔

بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجیب ملتی ہیں جس سے ہمارا یہ شبہ قوی ہو جاتا ہے کہ فاضل مولف جن کتابوں کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں ان کا مطالعہ یا تو انہوں نے بالکل نہیں کیا یا کیا ہے تو محض سرسری۔ مثلاً "نورس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ابراہیم پہلا بادشاہ تھا جس نے اردو میں ایک لمبی نظم لکھی ہے اس کا نام نورس اور موضوع موسیقی ہے"۔ نورس کو اردو کی کتاب کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گیتان جلی کو اردو کی کتاب کہے۔ نورس ٹھیٹ ہندی زبان میں ہے اور اسے اردو سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔

دوسری ایک عجیب بات بحری کے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں "غالباً وہ بہت اچھا شاعر تھا، بدقسمتی سے راقم کی نظر سے اس کی اردو نظم "من لگن" نہیں گزری"۔

یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اور یہ مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ دکن کے ہر شہر بلکہ گھر میں اس کا نسخہ ملتا ہے۔ خود عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اس کا نسخہ موجود ہے تعجب ہے کہ یہ عام اور مشہور کتاب مؤلف کی نظر سے نہیں گذری۔

بڑا نقص اس کتاب میں یہ ہے کہ انتخابات کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ محنت طلب کام تھا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ نامانوس اور مشکل اشعار اور الفاظ کا حل نہیں کیا گیا۔ پڑھنے والے کے لئے ایسی کتابیں کسی کام کی نہیں ہوتیں۔

آخر میں اس بات کا اظہار افسوس کے ساتھ کرتا ہوں کہ اگرچہ قابل مؤلف نے رسالۂ اردو کی تحریروں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور بعض مصنفین اور تصانیف کی معلومات صرف اسی رسالہ کی بدولت حاصل ہوئی ہیں لیکن اس کی طرف انہوں نے اس طرح اچٹتے ہوئے اشارہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس سے قبل یا اس سے الگ ان تصانیف کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔ حالانکہ میرانجی شمس العشاق برہان الدین جانم کی اکثر تصانیف، بحری، شوقی، ذوقی، میرانجی خدانما کے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا ماخذ صرف "رسالۂ اردو" ہے۔

مثلاً حسن شوقی کے کلام کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے کلام کے مخطوطے انجمن ترقی اردو میں بھی محفوظ ہیں۔ بڑی عنایت ہوتی اگر وہ یہ بھی بتا دیتے کہ حسن شوقی کی جن دو کتابوں

(ظفر نامہ نظام شاہ اور میر بانی نامہ) کا ذکر انہوں نے اپنی اس کتاب میں کیا ہے وہ ان
کی نظر سے گزری ہیں یا نہیں، اور ان کے نسخے اور کہاں کہاں ہیں۔ ایسے مصنف و مؤلف
جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے بلکہ
ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔

گنجینۂ تحقیق

از جناب پروفیسر سید محمد احمد صاحب بیخود، موہانی، ایم اے، پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ

یہ کتاب فی الحقیقت گنجینۂ تحقیق ہے اور بیخود صاحب کی علمی کاوش اور ادبی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

اس میں پانچ انتقادی مضامین ہیں۔ پہلا "آئینۂ تحقیق" (جلوۂ غالب، یعنی دیوان غالب (اردو) کی شرحوں پر ایک سرسری نظر۔ دوسرا "سرمۂ تحقیق" (حمایت غالب) بجواب نقد النقد بیخودی۔ تیسرا "سرمایۂ تحقیق" (حمایت غالب) چوتھا "مایۂ تحقیق" یعنی شرح قصائد خاقانی نوشتہ شادمان لکھنوی پر ایک نظر اور اس کا شرح پروفیسر نامی و شرح شادمان بلگرامی اور شرح جناب محشی سے تقابل اور قابل اختلاف مواقع پر ناقدانہ اظہار خیال، پانچواں "آیۂ تحقیق" یعنی حکیم ناطق صاحب لکھنوی کے تبصرۂ اصلاح سخن (شوق سندیلوی) پر ناقدانہ نظر۔ یہ پانچوں مضمون (۲۴۵) صفحوں پر ہیں۔

اردو میں مرزا غالب ہی کا کلام ایسا ہے کہ جس پر متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور آئندہ لکھی جائیں گی، یہ مرزا کے کلام کا اعجاز ہے۔ اس وقت نو شرحیں شائع ہو چکی ہیں جن پر اس کتاب کے پہلے مضمون میں سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد مرزا صاحب کا

ایک غزل کا حال اور شوکت میرٹھی، طباطبائی اور حسرت موہانی سے اتفاق و اختلاف بیان کیا گیا ہے۔ ان سب میں زیادہ مفصل اور ضخیم اور مشہور شرح مولانا طباطبائی کی شرح تو جیسی ہے سو ہے مگر اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل شارح اپنے آپ کو غالب سے کچھ کم نہیں سمجھتے۔ بعض اشعار پر ایسے ایسے عجیب اعتراض کئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور اکثر مقامات پر بقول بیخود صاحب "اس شرح میں انانیت اور پندار کے بادل جھوم جھوم کے اٹھے ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کے برسے ہیں"۔ اور کیا اچھی بات کہی ہے "اگر کچھ شکایت فاضل شارح سے ہو سکتی ہے تو اتنی کہ زیادہ نہ سہی غالب کو اپنا ہی سا نکتہ شناس و محقق سمجھا ہوتا"۔ حضرت بیخود نے اس شرح کی خوب قلعی کھولی ہے اور داد تحقیق دی ہے۔

یہ مضمون جب شایع ہوا تو اودھ پنچ میں "نقد انتقاد بیخودی" کے عنوان سے ایک مضمون اس کی تردید میں لکھا گیا۔ اس مضمون میں نہ تو مرزا غالب کی غزل کے حل پر خامہ فرسائی کی گئی اور نہ قابل مضمون نگار (حضرت بیخود) کی کسی رائے پر تنقید کی گئی بلکہ ان کی اردو دانی پر اعتراض تھے۔ اس دوسرے مضمون میں ان اعتراض کا جواب ہے۔ ہر لفظ اور محاورے کی تحقیق کی گئی ہے اور مستند اساتذہ کے کلام سے سندیں پیش کی گئی ہیں۔ اس سے بیخود صاحب کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مضمون مولانا طباطبائی صاحب کی طبع بلند کا نتیجہ تھا۔ اس میں بھی بیخود صاحب کے بعض اعتراضات کا جو انہوں نے کلام غالب پر فرمائے ہیں۔ بڑی خوبی سے

جواب دیا ہے۔ پڑھنے کے قابل ہے۔

"نگار" میں جو اپنی جدت نگاریوں کے لئے مشہور ہے ایک صاحب نے "آرگس" کی آڑ میں ایک مضمون "غالب بے نقاب" کے عنوان سے شایع کیا جس میں یہ ثابت کرنیکی کوشش کی گئی کہ غالب کے اکثر اشعار یا تو سرقہ ہیں یا توارد۔ مولانا بیخود نے اس کا بہت مدلل اور محققانہ جواب دیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ غالب کے اشعار کا ان اشعار سے مقابلہ کر کے دکھایا ہے جن سے سرقہ کرنے کا الزام دیا گیا ہے۔ شعر کی خوبی کو پوری طرح سمجھنا اور پھر ان خوبیوں کو اس طرح بیان کرنا کہ پڑھنے والے کی زبان سے بے اختیار تحسین و آفرین نکلے، ہر ایک سخن شناس کا کام نہیں۔ یہ حضرت بیخود ہی کا حصہ ہے۔ اس مضمون نے حضرت آرگس کی ساری لن ترانیاں خاک میں ملا دی ہیں۔ اس کے جواب بعض اور صاحبوں نے بھی لکھے تھے لیکن وہ تشنہ اور ناکافی تھے۔ بیخود صاحب کے جوابات بہت قابل تعریف ہیں۔ مضمون کے شروع میں سرقات شعریہ پر محققانہ بحث کی ہے۔

چوتھے مضمون میں قصائد خاقانی کی شرحوں پر ناقدانہ اظہار خیال کیا ہے اور اگرچہ فاضل مؤلف نے شادماں صاحب کی شرح کو دوسری شرحوں سے بہتر بتایا ہے لیکن جہاں جہاں ان سے چوک ہوئی یا کمی رہ گئی ہے تو اس کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔

پانچواں مضمون جو سب سے طویل ہے اور کوئی سوا سو صفحے پر ختم ہوا ہے وہ ناطق صاحب کے تبصرہ "اصلاح سخن" کے متعلق ہے۔ شروع میں فاضل مؤلف نے

ناطق صاحب کی عبارت کی سولہ سطروں پر (۲۷) اعتراض کئے ہیں جس کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد ناطق صاحب نے اصلاح سخن پر جو تبصرہ کیا ہے اور جن جن شعرا نے شوق صاحب کے اشعار پر اصلاحیں دی ہیں ان کے عیب و صواب مدلل طور پر ظاہر کئے ہیں "اصلاح سخن" پر مختصر سا تبصرہ اس رسالہ میں ہو چکا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شوق صاحب سندیلوی نے اپنی سو دو غزلیں مختلف اساتذہ کے پاس بھیج کر شاگردانہ اصلاح کی التجا کی اور پھر ان سب اصلاحوں کو حضرات شعرا کے نج کے خطوط کے ساتھ شایع کر دیا جس پر اخباروں اور رسالوں میں خوب خوب چہ می گوئیاں ہوئیں۔ یہ پانچواں مضمون انہیں اصلاحوں اور خاص کر ناطق صاحب کے تبصرے کے متعلق ہے۔ وہ قصہ پرانا ہو گیا ہے لیکن جو ذوق زبان رکھتے ہیں ان کے لئے یہ مضمون بہت دلچسپ ہوگا۔

یہ کتاب ادبی تنقید کے اعتبار سے بہت قابل قدر ہے۔ اس میں زبان و ادب کے متعلق بہت سے کارآمد نکات آ گئے ہیں جو طالبان سخن و ادب کے لئے متاع بے بہا ہیں۔

مولانا نیخود دیوان غالب اردو کی مفصل شرح بھی لکھ رہے ہیں بلکہ لکھ چکے ہیں ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ شرح بے مثل ہوگی۔

اربابِ نثرِ اردو

مؤلفہ سید محمد صاحب بی، اے عثمانیہ، مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن، قیمت دو روپے۔

یہ فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی اور تنقیدی تذکرہ ہے۔ شروع میں چند صفحے میں فورٹ ولیم کالج کا ذکر ہے اس کے بعد ڈاکٹر جان گل کرائسٹ اور اُن لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو کالج میں تالیف و ترجمہ کے کام پر مامور تھے۔ قابل مولف نے بڑی محنت اور کوشش سے ان حالات کو جمع کیا ہے اور ساتھ ساتھ ہر ایک کی تالیفات پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ دوران بیان میں بعض غیر متعلق بحثیں بھی آگئی ہیں لیکن اب تک اس تفصیل سے ان اربابِ نثر کا تذکرہ اردو میں نہیں لکھا گیا تھا۔

کتاب میں جابجا تعریض و تعلی کی جھلک پائی جاتی ہے جو ایک نوجوان مؤلف سے کچھ تعجب خیز نہیں۔ خطا تحقیق کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اگلوں کی تحقیق پچھلوں کی رہنمائی کا کام دیتی ہے، اگر اس میں کوئی فروگذاشت رہ گئی ہے تو آنے والے اس کی اصلاح کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ تحقیق اگلوں کی ہو یا پچھلوں کی قابلِ قدر ہے اگر اس میں کوئی خطا ہے تو قابلِ اصلاح ہے نہ کہ لائق سب و شتم۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ لائق مؤلف کا یہ خیال ہے کہ اگلے بر سر خطا تھے اور مؤلف کی تحقیق خطا اور غلطی سے پاک ہے تحقیق اُن کی بھی ایسی ہی قابل قدر ہے جیسی مؤلف کی، رہی خطا سو ان کی تحریروں میں بھی ایسی ہی پائی جاتی ہے جیسی اس تالیف میں، مثال کی طور پر چند فرو گذاشتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے نہ اس لئے کہ ہم اسے قابل اعتراض سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ قابل مؤلف کو معلوم رہے کہ ادبی اور علمی معاملات میں ایسی تحقیق جو خطا و سہو سے بھی بری ہو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اشتیاق، کو مؤلف نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سمجھا ہے میر تقی میر اور میر حسن کے تذکروں کے شائع ہونے کے بعد یہ غلطی نہیں ہونی چاہیے تھی یہ صاحب مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے اور کوئلہ فیروز شاہ میں رہتے تھے۔

محمد خلیل خاں یا خلیل علی خاں اشک کی تالیفات میں انتخاب سلطانیہ کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے بعض مؤلفین مثلاً حاجی مرزا مغل، مولوی نور علی، سید بخش علی منشی محمد بخش وغیرہ کا کتاب بھر میں کہیں نام نہیں اور نہ اُن کی کسی تالیف کا ذکر ہے۔ جو موجب تعجب ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں "اپنی کتاب آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن کے وقت اس کو الٰہی بخش سے لکھواتے ہیں"۔ الٰہی بخش کوئی شخص نہیں تھا، یہ

امام بخش صہبائی تھے جو فارسی کے بڑے استاد اور ادیب گزرے ہیں۔
اسی قسم کی خامیاں کتابوں کے تبصروں میں بھی جابجا پائی جاتی ہیں۔ مگر اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مولف کی کوشش اور محنت ہر حال میں قابل قدر ہے۔

اکبر الہ آبادی

مؤلفہ جناب طالب الہ آبادی ۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد ۔ صفحات ۴۸۲
قیمت قسم اول مجلد سات روپے آٹھ آنے، قسم دوم مجلد پانچ روپے

زمانہ حال میں اردو کے تین بڑے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے غزل کی تنگنا سے نکل کر شاعری کے صحیح مفہوم کو سمجھا۔ تینوں کے کلام میں زمانے کا رنگ نظر آتا ہے حالی کے کلام میں جو درد اور سوز و گداز ہے وہ کسی کو نصیب نہ ہوا۔ وہ مسلمانوں کی خانہ خرابی پہ آنسو بہاتا ہے اور اس کے ساتھ اس بگڑے ہوئے گھر کے بنانے کا شوق دلاتا ہے۔ اقبال کا کلام جوش اور غیرت سے بھرا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کو عمل کی دعوت دیتا ہے اور مغربی تہذیب اور ہندی اثر سے بچنے اور آئین اسلام پر قائم رہنے کی ہدایت کی ہے وہ چاہتا ہے کہ اسلام سارے عالم پر چھا جائے اور دنیا کی خرابیوں کا علاج کرے۔ اکبر مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہے اور جب وہ مسلمانوں کو اس رنگ میں دیکھتا ہے تو اس سے نہیں رہا جاتا اور ظرافت میں بجھے ہوئے نشتر سے کام لیتا ہے۔ اس کے کلام کی بڑی خصوصیت ظرافت بلکہ طنز و تشنیع ہے اور اسے وہ اس مزے سے کہہ جاتا ہے کہ جن کے خلاف ہے وہ بھی لطف لیتے ہیں۔

اکبر کے حالات اور کلام پر متعدد مضامین اور رسالے شائع ہو چکے ہیں لیکن طالب صاحب نے جس تحقیق اور محنت اور تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں اور اُن کے کلام کی خوبیوں کو دکھایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ اکبر کے سچے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس کے ساتھ صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ تلاش اور جستجو سے گھبراتے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکبر کے جو حالات محنت اور تحقیق سے جمع کئے ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا، اور اس سے زیادہ اُمید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے۔ حالات سے زیادہ ان کے کلام سے بحث کی ہے اور مختلف عنوانات کے تحت میں اُن کے کلام کا بہترین انتخاب بڑے سلیقے سے اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ جن کو اکبر کا ضخیم کلیات مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں وہ اسے پڑھ کر بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کلام کے بعد ان کے بیشمار خطوں کے اقتباسات اس خوبی سے دئیے ہیں کہ ان کی زندگی کے ظاہر و باطن کا سارا حال آشکارا ہو جاتا ہے اکبر کے خطوں میں بہت کم وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام میں ہیں۔

اکبر مذہبی شخص ہیں مگر متعصب نہیں۔ وہ پرانی وضع کے سچے مسلمان ہیں وہ اسی وضع پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی وضع میں دیکھنا چاہتے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نئے خیالات اُمڈے چلے آتے تھے اور پرانے خیالات کے پانوں اکھڑ رہے تھے کہ اکبر نے مشرقی تہذیب کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور مغربی تہذیب کے شیدائیوں کی حماقتوں اور فضولیوں کی ہنسی اُڑانی شروع کی۔ وہ علی گڈھ کی

جدید تحریک پر زہر میں بجھی ہوئی چوٹیں کرتا ہے، وہ بے پردگی پر طرح طرح کی پھبتیاں کہتا ہے اور نئی تحریکوں اور جدید خیالات کا خوب خاکہ اڑاتا ہے۔ وہ والٹیر کا بالکل ضد ہے اس کا خیال ہے کہ یورپ کی مادیت سے اسلام اور اسلامی تہذیب خطرے میں ہے اور ان کو مغربی سائنس اور فلسفے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نئی روشنی کا سخت دشمن ہے اور اس کی طرح طرح تضحیک کرتا ہے گو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے جدید خیال کے دیو کو پسپت کر دیا ہے لیکن حقیقت میں وہ سائے سے لڑ رہا ہے لیے ایسے کوتہ اندیش ہندی جو اپنی ظاہری طرز معاشرت میں یورپینوں کی نقالی کرتے ہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اُن کے خلاف اس کا غصہ اور اس کی نکتہ چینی سچے دل سے ہوتی ہے۔

اس کا طرز شستہ اور ظریفانہ ہے لیکن اس کے اشعار ہمیشہ بے عیب نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ لفظوں کے الٹ پھیر اور قافیہ بندی سے بہت کچھ اثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اکثر شعر محض قافیہ کے خاطر کہے ہیں، وہ شعر شعر نہیں رہے لطیفے ہو گئے ہیں۔ اس میں بہت کچھ شبہ ہے کہ آئندہ نسلوں میں بھی وہ ایسا ہی مقبول ہوتا جیسا وہ اپنے زمانے میں تھا یا آج کل ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا ابھی مشکل ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے شعرا میں تھا یا نہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے رنگ میں بے نظیر ہے اور اس کی تقلید نہایت مشکل ہے۔

مذہب پر اکبر کا بہت بڑا اعتقاد تھا وہ ایک باخدا اور صوفی منش آدمی تھے۔

لیکن ساتھ ہی وہ بہت بزدل اور ڈرپوک بھی تھے۔ اس اعتقاد پر یہ بزدلی بہت حیرت انگیز ہے
زمانہ انتقام لئے بغیر نہیں چھوڑتا اکبر جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے سخت
دشمن تھے اپنی اولاد کو اس سے نہ بچا سکے اور خود انہوں نے ان کو وہی تعلیم دلائی
جس کی وہ عمر بھر مخالفت کرتے رہے۔

طالب صاحب نے اکبر کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جہاں کہیں ان کو
کوئی سقم نظر آیا ہے تو اسے بھی بے تکلف ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے قبل جن صاحبوں
نے اکبر پر کچھ لکھا ہے ان پر کسی قدر سختی سے تنقید کی ہے خاص کر مولف تاریخ
ادب اردو پر۔ واقعات کی تحقیق میں لغزش ہو ہی جاتی ہے اس پر اس قدر تشدد
درست نہیں خصوصاً جب کہ لکھنے والے کی کوئی بدنیتی نہ ہو۔ اس کتاب میں طالب صاحب
نے دو جگہ اس مشہور قطعہ کو جس کا دوسرا مصرع "دکھلا کے سبز باغ عذاب و
ثواب کا" ہے۔ سودا سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ یہ قطعہ قاضی محمد صادق خان
اختر کا ہے اس قسم کی لغزشوں سے کوئی پاک نہیں اور اس لئے ایسی فروگزاشتوں
پر سختی سے نکتہ چینی کرنا جائز نہیں۔

ہم طالب صاحب کی محنت، تحقیق اور ذوق کی دل سے داد دیتے ہیں
اور ہمیں امید ہے کہ تمام اہل ذوق اس کتاب کی قدر کریں گے۔

پنجاب میں اردو

انجمن ترقی اردو۔ اسلامیہ کالج لاہور۔ صفحات (۳۱۱) قیمت دو روپے آٹھ آنے

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہر صوبہ اردو کو اپنی زبان بتاتا ہے اور مدعی ہے کہ یہ زبان وہیں بنی اور وہیں سے نکلی۔ سب سے پہلے یہ صدا دکن سے اٹھی۔ اور اسے اس کا حق تھا اس لیے کہ ابتدا میں اسی نے اس کی نشو و نما کی اور اس کی ادبی حیثیت کو فروغ دیا۔ اس کے بعد یہ آواز پنجاب سے آئی۔ اسے بھی حق حاصل ہے کیونکہ زمانہ حال میں پنجاب نے اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے پنجاب کے بارے میں اس سے قبل بھی دو ایک صاحبوں نے ایسا خیال ظاہر کیا تھا لیکن وہ محض قیاس ہی قیاس تھا، اب پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے اس پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالی ہے۔

قابل مصنف اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ (اردو) زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی ہے" امیر خسرو اور ابوالفضل اس زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔ اب اس پر سے وہ یہ قیاس کرتے ہیں کہ چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی گئے اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں

یہ پروفیسر صاحب کا قیاس ہے لیکن ساتھ ہی وہ از روئے انصاف یہ بھی کہتے ہیں کہ "اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں لیکن سیاسی واقعات اور اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں"۔

سیاسی واقعات کی بنیاد صرف اس قیاس پر ہے کہ پنجاب سے مسلمان ہجرت کر کے گئے، اس لئے جو زبان وہ وہاں سے ساتھ لیتے گئے وہی دلی میں بولی جانے لگی اور یہ وہی زبان تھی جو اب اردو کہلاتی ہے۔ یہ کسی صورت سے بھی قابل تسلیم نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص پنجاب سے ہو کر یا وہاں رہ کر دہلی آئے تو وہ اپنی زبان دہلی میں رائج کر دے گا۔ اول تو یہ قیاس ہی صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی ہجرت پنجاب سے یکبارگی اس کثیر تعداد میں ہوئی کہ وہ دہلی پر اس طرح چھا گئے کہ انہیں کی زبان رائج ہو گئی اور سب اہل دہلی اور نواح دہلی نے اسے اختیار کر لیا دوسرے پنجاب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل طور سے بن سکتی وہ اس زمانے میں اس قدر پامال رہا اور اس کی حالت ایسی ناقابل اطمینان تھی کہ وہاں اس کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ باقی رہا یہ امر کہ بعض الفاظ پنجاب سے آئے اور وہ دہلی میں رائج ہو گئے تو اسے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر زبان میں ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ آ کر نہیں مل گئے۔ کسی زبان کے بننے کے لئے

میں استقلال حکومت اور تہذیب و شائستگی کا ہونا ضروری ہے اور یہ دہلی ہی میں میسر ہوا
مسلمان جو غزنی، ترکستان اور ایران سے آتے تھے اُن کی اپنی زبان فارسی تھی اور
آپس میں یہی زبان بولتے تھے۔ خاص ضرورت کے وقت یا نوکر چاکروں سے جو مقامی
زبان میں ایک آدھ فقرہ بول لیا جاتا ہے اُس کی حالت جیسی کچھ ہوتی ہے وہ ظاہر ہے
جیسے اس کی شان دیکھنی ہو وہ کسی انگریز کو اردو بولتے ہوئے دیکھ لے۔ ایک افغانی
کی یا ایرانی کے لئے یہاں کی زبان ایسی ہی اجنبی تھی جیسے انگریز کے لئے۔

پگ، مٹھ، انب، گاڈی، گڈی، تل وغیرہ الفاظ کے لئے آٹھویں اور نویں صدی
کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب بھی یہ الفاظ
اسی طرح دیہات اور بعض شہروں میں برابر بولے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ آٹھویں یا
نویں صدی میں یہ الفاظ پنجابی سے آئے اور اب اہل ہندوستان انہیں پاگ، ماٹ،
امب، گاڈی، گڑبا، تالاب بولنے لگے۔ ان الفاظ کی اصل ایک ہے، دونوں طرح
بولے جاتے تھے، ایک صورت ادبی زبان میں متروک ہوگئی، دوسری رہ گئی لیکن
بول چال میں اب تک یہ الفاظ دونوں طرح بولے جاتے ہیں اصل ایک ہی ہے،
نہ مختلف مقامات میں آوازوں میں اختلاف ہوگیا مثلاً آم کو سنسکرت میں امبہ
کہتے ہیں۔ اسی سے انب ہوا اور اسی سے ام بنا۔ مونگ سنسکرت میں مُدگ ہے
اسی سے مونگ اور منگ بن گیا۔ جامن کو سنسکرت میں جمبو کہتے ہیں اسی سے
جامن اور جمو ہوگیا۔ سنسکرت میں لوک سے پہلے لوک ہی لکھتے اور بولتے تھے

بعد میں لوگ کہنے لگے ۔ پرانی اردو کی کتابوں میں لوک ہی آتا ہے ۔ لکھنا جو پنجابی اور
پرانی (دکنی، گجراتی) اردو میں استعمال ہوتا ہے، سنسکرت کا لکھیان ہے جس سے
دیا لکھان بھی بنا ہے ۔ ان لفظوں کو پنجابی قرار دینا صحیح نہیں ہے ۔

فارسی لغات بھی اس معاملے میں مستند نہیں ہو سکتیں، انہوں نے فارسی الفاظ
کے مقابل ہندی کے مقامی الفاظ لکھ دئے ہیں ۔ اردو یا ہندی اس وقت سیال
حالت میں تھی اور فصیح اور غیر فصیح کا کوئی معیار قرار نہیں پایا تھا، یہ سب باتیں بعد
کی ہیں ۔ مثلاً کبھیں، کبھو، کبھی تینوں استعمال ہوتے تھے، کبھو اب تک استعمال
ہوتا تھا اور اب بھی بعض بعض مقامات پر بولا جاتا ہے لیکن ادبی زبان میں غیر فصیح
قرار پایا اور کبھی عام طور پر استعمال ہونے لگا ۔ یا "جاوے ہے" اور "جاتا ہے"، ذوق
و غالب کے وقت تک بولے اور لکھے جاتے تھے اب "جاوے ہے" متروک ہو گیا
اس کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ یہ لفظ جواب فصیح مان کر استعمال ہونے لگے ہیں کہیں
دوسری جگہ سے آ گئے ہیں ۔

اس معاملے میں اسما و صفات کی شہادت سند نہیں ہو سکتی، البتہ افعال
خاص طور پر قابل لحاظ ہوتے ہیں ۔ یہ خیال کہ پنجابی افعال کے آخر الف آتا ہے اور
اردو میں بھی یہی ۔ اسی لئے اردو پنجابی سے بنی ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ ہندی
کی کئی شاخوں میں یہ صورت قدیم سے چلی آ رہی ہے اور اس کی سینکڑوں مثالیں
پیش کی جا سکتی ہیں ۔

ہیم چندر سوری نے اپنی کتاب سدھ ہیم شبد انشاسن (نحو) میں سمبت (۸۰۰)

۹۰۰ کی اپ بھرامش (بگڑی) بھاشا کا جو نمونہ دیا ہے اس میں ایک یہ شعر ہے۔

بھلا ہوا جیو ماریا بہینی مارا کنتو   لجے جنتو وینسی ہو جد بھگا گھر وا ینتو

اس میں ماضی مطلق وہی ہے، جو اب بھی استعمال ہوتی ہے۔ امیر خسرو اور کبیر کے ہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں مثلاً

بھید پہلی میں کہی، سن لے میرے لال   عربی فارسی ہندی تینوں کرو خیال

(امیر خسرو)

رات گنوائی سوے دوس گنوائیو کھائے   ہیرا جنم انمول تھا کوڑی بدلے جائے

(کبیر)

دھن راجا تو ہیں راج بھیکھا   جہ کی رجائس سب کچھ دیکھا

(ملک محمد جائسی)

دوسرے افعال :-

کبیر گرو نہ کیجئے کال کہے کر کیس   نا جانو کٹ ماری ہے کیا گھر کیا پردیس

(کبیر)

سائیں اتنا دیجئے جا میں کٹم سمائے   میں بھی بھوکا نا رہوں اور سادھو نہ بھوکا جائے

(کبیر)

آیا ہے سو جائے گا راجا رنک فکیر   ایک سنگھاسن چڑھ لے ایک بندھے جنجیر

(کبیر)

کبیر اور میرا بائی دو ایسے شاعر ہیں، جو عوام کی بول چال میں سادہ ہندی لکھتے ہیں اور اس لئے اُن کی زبان سند ہو سکتی ہے۔

درد کی ماری بن بن ڈولوں ویدیلیا نہیں کوئے
میرا کی پربھو پیڑ مٹے گی جب وے سانوریلیا ہوئے — (میرا)

بھائی چھوڑیا، بندھو چھوڑیا، چھوڑیا سگا ہوئے (میرا)

آج کہے کل بھجوں گا کالے کہے پھر کال
آج کال کے کرت ہی اوسر جاسی چال (کبیر)

سی علامت مستقبل ہے۔ پنجاب کے بعض ضلعوں میں بھی مستقبل کی یہ صورت مستعمل ہے۔ لیکن یہ علامت پنجاب سے نہیں آئی، بلکہ اسکی اصل سنسکرت سے ہے سنسکرت میں لفظ شیتی علامت مستقبل ہے، جو آگے چل کر سیتی بھی ہو گیا ہے اور پھر ہندی کی مختلف (شاخوں) زبانوں میں یہ لاحقہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے گجراتی میں جا کر مفرد کے لئے ایش ہو جاتا ہے اور جمع کے لئے اشئے (جیسے کہیش (کہے گا) اور جائیش (جائے گا) اور کرشئے (کریں گے) آوشئے (آئیں گے) پنجابی میں یہ سی، ماضی متعدی اور مستقبل کے لئے مستعمل ہے، مشرقی راجستانی میں بھی مستقبل کے لئے آتا ہے (جیسے سی، سوں، ساں، سو) اسی طرح ریوائی اور بھوج پوری زبانوں میں بھی لہجے کے کسی قدر اختلاف کے ساتھ اس کا استعمال مستقبل کے لئے اب تک رائج ہے اور پراکرت میں یہ لاحقہ سِس، سسامی

ہسی وغیرہ کی صورت میں استعمال ہوتا تھا، سوا سینی میں بھی جس سے برج بھاشا، گجراتی وغیرہ زبانیں نکلی ہیں، یہ لاحقہ اس صورت میں پایا جاتا ہے، اپ بھرنش (بگڑی ہوئی پراکرت) میں اس کی صورت سوں، سوں، سسی، سسے، سئی وغیرہ ہے پرانی دکنی میں بھی یہ "سی" فعل مستقبل کے لئے اسی طرح استعمال ہوا ہے، چنانچہ "سب رس" اور بعض دوسری کتابوں نیز شاہ برہان وغیرہ کے کلام میں بلا تکلف استعمال ہوا ہے جیسے کرسی، جاسی، ہمیں نا کرسیں نا دیکھ سوں، کرسوں، کہہ سوں وغیرہ۔

اب پنجابی کے دوسرے افعال دیکھئے۔ جاوندا، کھاوندا (جانا، کھانا) آیا سی، گیا سی (آیا تھا، گیا تھا) کردا اے (کرتا ہے) ان صورتوں کا کوئی تعلق اردو سے نہیں۔

اسی طرح ضمائر میں فرق ہے۔ اسی (ہم) تسی (تم) اردو سے بالکل اجنبی ہیں۔

پنجابی اور اردو کے اکثر الفاظ کی تذکیر و تانیث کی مشابہت بھی کوئی ثبوت اس کا نہیں کہ پنجاب سے اردو پہنچی ہے۔ قدیم اردو کو دیکھا جائے تو اس میں تذکیر و تانیث کے معاملے میں بڑی آزادی تھی اور آج کل کی طرح تشدد نہ تھا۔ اس وقت یہ ثبوت پیش کرنا کچھ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا اثر پنجابی پر پڑا ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ پنجابی میں جو تھوڑی بہت مشابہت اُردو سے پائی جاتی ہے وہ اردو کا اثر ہے نہ پنجابی کا۔ اردو مسلمانوں کی ایک عام زبان ہو گئی تھی اور اس لئے ہر صوبے کے نامور شاعر اسی زبان میں شعر کہتے تھے تاکہ ان کے کلام کو زیادہ شہرت اور مقبولیت ہو۔ چنانچہ دکن، گجرات نیز پنجاب میں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں میں ہندی عام زبان تھی اور اور دوسرے مقامات کے لوگ بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ مثلاً مرہٹوں میں کئی نامور شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا کلام ہندی میں بھی پایا جاتا ہے حالانکہ ہندی اُن کی مادری زبان نہ تھی۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اصل مضمون کی تحقیق میں ضمنی باتیں زیادہ کار آمد اور قابل قدر نکل آتی ہیں۔ یہی حال اس کتاب کا ہے۔ فاضل پروفیسر شیرانی کو اگرچہ اصل بحث میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی، لیکن اس ضمن میں انہوں نے ایسی ایسی تحقیق کی ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔ اس میں شمالی ہند اور پنجاب کے قدیم اردو لکھنے والوں کو جو انہوں نے کھوج لگا کر نکالا ہے، وہ بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ادبی اور لسانی نکات ایسے پائے جاتے ہیں جو ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔

پروفیسر شیرانی کی یہ کوشش اُردو داں طبقے کے لئے قابل فخر ہے۔

فیضانِ شوق

دیوان منشی احمد علی صاحب شوق۔ قدوائی لکھنوی مرحوم
حجم (۳۰۰) صفحے۔ سائز ۲۰×۲۶۔ قیمت دو روپے، لکھائی چھپائی
کاغذ بہت عمدہ۔ معہ تصویر مصنف۔ پتہ:۔ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد
صاحب۔ بیرسٹرایٹ لا، گونڈہ (اودھ)

سحر البیان منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی مرحوم۔ اردو زبان کے ان استادوں اور مسلم الثبوت شعرا میں تھے، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر تھے اور جن کی تمام زندگی اس فن شریف کی خدمت میں گزری ہے اس چند سال کے اندر نہایت افسوس ہے کہ ہماری زبان کے کئی گراں پایہ انشا پرداز اور شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے، اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب شاد عظیم آبادی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، مولانا شرر لکھنوی، اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادب اردو کے زبردست ارکان تھے۔

حضرت شوق قدوائی ایک قادر الکلام، کہنہ مشق اور رنگ قدیم و جدید کے مالک تھے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعہ اضداد ہستی تھے۔ ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھئے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں، قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے لکھنؤ کا فرسودہ رنگ رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات، ضرب المثال بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں، اور آورد کو آمد بنانے کی بھی ...ہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے۔ اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ کمال مشاقی کی دلیل ہے کہ کلام گنجلک نہیں ہونے پایا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا زور زیادہ تر لفظی صنایع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم۔ برخلاف اس کے ان کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں۔ اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ خاص کر "عالم خیال" جس میں ایک ایسی خاتون کے جذبات و خیالات ظاہر کئے ہیں جو اپنے شوہر سے دور ہے، یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل نظم ہے، خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ اور نظمیں بھی اچھی ہیں۔

دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر کتابی صورت میں چھپے تو اچھا خاصہ حجم ہوگا۔ اور ہمارا یہ خیال ہے کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت ان کے مجموعۂ نظم کی ملک کو ضرورت تھی۔

زیر تنقید دیوان میں غزلیں ہیں، مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں جو آج کل مقبول ہے۔ اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہے۔ کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہوگیا۔ اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب تلف کر دیا۔ آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعات اور رباعیات ہیں۔ مگر ان میں بھی جان شاعری کی وہی کمی ہے جو غزلیات میں ہے۔ ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہے کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف شستہ اور صحیح استعمال کی ہے اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہے، جو متقدمین کی خصوصیت تھی۔ رعایت لفظی زیادہ نہیں۔ لیکن صحت زبان اور محاورات و ضرب الامثال بندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجودہ دور ادب اور مذاق سلیم کے لئے دل چسپ ہو سکتی ہے۔

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ طاہر علی صاحب کا ایک صفحے کا دیباچہ ہے، اس کے بعد مولوی معین الدین صاحب بی، اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہے، جس میں مصنف کے سوانح حیات، خصوصیات کلام، خصائل، مزاج، تصانیف و کلام پر تبصرہ

اور بہت سی باتیں آگئی ہیں، تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہے
اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کے تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں کیا گیا
ہے۔ بعض کا نام تک مذکور نہیں۔ دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں اس کے
علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئیں۔

دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہونا — کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہونا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دوران طباعت میں بحث ہو چکی ہے، آخر
میں تمام "عقیدت مند" اسی نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کر لی جائے،
اور اُن پر حرف نہ رکھا جائے مطلع بجنسہ رہنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال
میں زبردستی ہے، جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیئے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کھپتا
ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہے۔ کیا لکھنؤ میں اب کوئی ایسا زباں داں نہیں جو اس
معمے کو حل کرتا، یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جا سکتا۔ یہ مطلع طبع
دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفسار آیا تھا تو انہوں
نے یہ لکھ دیا تھا کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ہی) یا (بھی) ہے، اس صورت میں
مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے، اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقیدت مند
کب مانتے ہیں۔ یہ پہلی غزل حمد میں، شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل
ذکر نہیں، دو ایک شعروں میں ناگوار تعقید بھی ہے دوسرے صفحے سے عشقیہ کلام

شروع ہوتا ہے، پہلا مطلع یہ ہے :-

دل گیا میرا تو پھر تیری گرہ سے کیا گیا
بکتے بکتے تو، تو اے ناصح مرا سر کھا گیا

یہ "تیری گرہ سے کیا گیا" نظم کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ ایسے شعر وہ خود بہت پسند کرتے اور فخریہ جھوم جھوم کر سناتے تھے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو، اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرع میں "کچھ" کچھ بوہیں سا ہے، اور دوسرے میں "ذرا سا حسن" معشوق کے لیے کہنا صحیح ذوق محبت کے منافی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے۔ اور فرماتے ہیں :-

مرے منھ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹھوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا

یہ آہیں چند میں نے کھینچ دیں صرف اوپرے دل سے
اثر کی کب تمنا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھینچ دینا، یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں۔ آہیں کھینچیں ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں "مرے منھ پر" بھی اچھا نہیں ہے۔ اس زمین میں،

یہ شعر خوب کہا ہے:۔

تمہاری غیر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھے وہ بھی اک زمانہ تھا۔

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے۔ یہ حالت ایک وقت انسان پر گذرتی ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے۔

ذیل کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے اشعار ایسے ہیں، جن پر خود مصنف کو ناز تھا اور بہت سے احباب و عقیدت مند محض مروتاً شوق سے سنتے اور جوش و خروش سے داد دیتے تھے۔ آخر میں تو وہ صرف لغت و زبان کی ضرورت سند کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ محاورات نظم میں بند جائیں تاکہ لغت کی کتابوں کے لئے سنداً آئندہ کام آئیں فرماتے ہیں:۔

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے راز عشق نہ کہنا تھا
"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اتنا سمجھے رہنا تھا

کیوں ہنستے ہو، میں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گذرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالباً جو گیا لباس مراد ہے جو بعد کو شدت جنوں نے اتار پھنکوایا اب شاعر ننگا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں۔ یہ قطعہ میر تقی کی شاعری اور انسی دور قدیم کی یاد دلاتا ہے۔

ہمت ہاری، جی چھوڑ بیٹھے، سب لذت کھوئی اے شوق
مرنے کی جلدی ہی کیا تھی، عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بحروں میں، آخر عمر میں بہت طبع آزمائی کی ہے۔ مگر دل میں وہ درد، وہ کسک نہیں، نہ صحیح مذاق شعری، اور محبت کی چاشنی ہے بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں، یہ شعر بھی بڑے مزے کا کہا ہے :۔

آنکھ اس ادا سے اس نے دکھائی کہ میں نے شوق
چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا

کوئی نئی بات نہیں، مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صفائی و سادگی اور بندش کی برجستگی و چستی نے خاص مزہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ شعر انہیں کے رنگ کا ہے

وہ بدخو ہے، اور ٹھکانا ڈھونڈیں دل بہلانے کا
اب سے آئے گھر سے اٹھ، نام نہ لیں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک محاورہ کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے

رامپور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا، وہ ایسی بحروں میں فکر کرتے تھے، قدرت کلام حاصل تھی، مگر رعایت لفظی اور محاورہ بندی ہاتھ کہاں جاتی ہے۔ درد و اثر۔ جذبات نگاری، محاکات، جو تغزل اور شعر کی جان ہے بہت کم پائی جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں کچھ جھلک ہے۔ مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے کچھ جلنے لگا کباب کا سا

بیٹھ گیا شوقؔ، ایک گلی میں | کیا جانیں کیا جی میں آیا
شباب آیا، وہ اینٹھے ڈھاتے ہیں | نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال | کہاں کا دل ہمیں اب کیا رہے ہیں
جتنے ٹکڑے ہیں دل ناکام کے | سب نگینے ہیں تمہارے نام کے
پڑتی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر | منھ چھپا او سونے والے بام کے
سن کے میرا نام بولے کون شوقؔ | سینکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے

کیا مزیدار شعر کہے ہیں، زبان کی سادگی قابل داد ہے، اور سنئے۔

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی | بیٹھو تو کہوں ادھر ادھر کی

ذیل کا شعر کیا لاجواب کہا ہے۔

دامن کو ذرا بچائے رہنا | دنیا نہیں گرد ہے سفر کی
کٹ گئی عمر لکھتے لکھتے خط | اور ابھی حال عشق مجمل ہے

بہر حال دیوان شوقؔ جیسا کہ مقدمہ نگار صاحب نے لکھا ہے "زیادہ تر اس غرض کے لئے ہے کہ آئندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ان کے نتائج کتب بینی اور پنجاہ سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھائیں" مگر شاعرانہ دل فریبیاں بھی اس کے صفحات میں ملتی ہیں اور وہ قدیم طرز میں بھی بندش سے بعض اوقات خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ہم نہ مانیں کہ کھلی سرخی خواب آنکھوں سے | پھوٹ نکلا ہے ترا رنگ شباب آنکھوں سے

دو گھڑی کے لئے وہ آئے تو دو گھر لوٹے
لے گئے چھین کے دل سینے سے خواب آنکھوں سے

کیا مشکل زمین ہے جس میں (آنکھوں سے) ردیف ہے، مگر کیا اچھے اچھے شعر اپنی مشاقی اور قادر الکلامی سے نکال لئے ہیں اور دیکھئے :-

آہ نے تو اس نے کی مری دل سوزیوں کی قدر
تربت پہ اک چراغ سر شام رکھ دیا

گل ہو کے میں کیا ہنستا ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا

اس میں جنم گزرا باندھا گیا ہے، خدا جانے یہ کہاں تک بلحاظ زبان ٹھیک ہے نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے دیوان شوق میں غزلیں ملیں گی یہ کیا خوب کہا ہے :-

رونے سے میرے کھل گیا ظالم پہ دردِ عشق
ہچکی جو آئی، منہ سے کلیجا نکل پڑا

ذوق و ظفر کی طرح ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت شوق کو محاورہ بندی و مثل بندی کا جیسا شوق ہے ویسا ہی مشکل زمینوں میں بھی کہنے کا ذوق و ملکہ رکھتے ہیں اور ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ ان کی قدرت کلام کو ماننا پڑتا ہے۔ مگر اپنا رنگ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ فرماتے ہیں :-

میں غیر ہوں اس سے یہ کھٹک جائے تو اچھا
دل اس کا مرے دل سے اٹک جائے تو اچھا

دل مرا ٹوٹا تو اس کو کچھ ملال آ ہی گیا
اپنے بچپن کے کھلونوں کا خیال آ ہی گیا

وصل کی شب مجھے کیا کیا ہوئے دھڑکے سے دل
اس کی پرچھائیں میں تھا نور سحر ہی کا سا

کچھ ہمارا رنگ اس کی مہندی کا تو لطف آنے لگا
چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکانے لگا

دو شعر یہ بھی کیا خوب ہیں :-

ہاتھوں سے منہ چھپا کر دل مفت لو کسی کا
پھر بھی کہیں ہوا ہے سودا ہنسی خوشی کا

پامردی جنوں نے کیا کیا دکھائیں سیریں
وارفتہ ہو گیا میں صحرا کی زندگی کا

یہ زمین دیکھئے :-

سر کو کسی معشوق پہ وار آؤں تو اچھا
جن عشق کا یوں سر سے اتار آؤں تو اچھا

اس قسم کا ابتذال مذاق ہمارے قدیم استادان فن کے کلام میں اکثر ہے اور یہ نتیجہ ہے لفظی شاعری کا۔ ذیل کے شعر میں ایک بات پیدا کی ہے۔

جبر شیوہ نہیں ارباب وفا کا ورنہ
تو مقید کشش دل کے اثر میں رہنا

حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن

یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستم گر ہونا

جان اب نہیں باقی ہے مجھے دفن کرا دو
تم دل پہ نہ جاؤ یہ اچھلتا ہی رہے گا

دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
پھٹ پڑی اس پہ جوانی تو میں مجبور ہوا

میری قسمت سے ہوا ندر تغافل وہ بھی
میں تو سمجھا تھا کہ جور اب ترا دستور ہوا

ناخن اب کاوش ہر روزہ کے غم سے چھوٹا
مستقل لطف ہوا، داغ جو ناسور ہوا

ضعف میں بھی کام مثل رنگ چل ہی جائے گا
ہو نہ ہو جنبش مرا پہلو بدل ہی جائے گا

ذیل کا شعر بھی آج کل کون پسند کرے گا۔

یاد آئے گا چھٹی کا دودھ جس دن اسے مسیح
اس لب معجز نما کا سامنا کرنا پڑا

اس زمین میں اور بھی شعر ہیں مگر ہمارے کام کا کوئی نہیں، ابتدال کا ایک شعر اور دیکھیے :-

بلبل سے اڑا دیتے ہیں گل مجھ کو دکھا کر دیتے ہیں وہ دھوکا کہ یہ ہے گال ہمارا

یہ شعر اچھا کہا ہے :۔

میں کس امید پہ دیکھوں تمہ ظریف کا منھ   جواب ایک تبسم ہے سو سوالوں کا

یہ پوری غزل سلجھی ہوئی اور اچھی ہے۔ پھر کہتے ہیں :۔

دل پڑا نظروں کی تیغوں میں تو کٹ ہی جائیگا   ٹکڑے ٹکڑے ہو کے پھر غمزوں میں بٹ ہی جائیگا

ہم وہ ہیں کہ حشر میں غافل ہوں آپ سے   میدان ہی میں اٹھ کے قدم لیں گے دیکھنا

یہ شعر داد طلب نکل گیا ہے۔

وہ دن فراق کا کہ نہ لائے خدا جسے   اس عشق میں پڑا ہے بہر طور دیکھنا

کچھ سہارا مرے جینے کا رہا ہی کب تھا   ابھی مرتا نہیں تم نے یہ کہا ہی کب تھا

دل ہی قابو میں نہیں تجھ پہ جو قابو ہو تو کیا   پاس دونوں سے ہے اب دل ہو تو کیا تو ہو تو کیا

تب تو مارے مجھے حشر آیا تو گھبرا اٹھے نا ؟   میں نے کہنا تھا کہ پچتاؤ گے پچتائے نا ؟

کوئی مقام نظر آگیا جو بن کا سا   کہا جنوں کہ نے یہ ہے میرے وطن کا سا

یہ سب غزلیں مشکل زمین میں ہیں اور یہ زیادہ تر خود حضرت شوق ہی کی اختراع ہیں۔ شعر تقریباً ایسے ہی ہیں جیسے یہ مطلعے ہیں۔ یہ شعر غور طلب ہے۔

چمن سے صبر ہے مجھ تک ہوا تو آنے دے   نہ بستنی کو مرے پنجرے پہ کس صیاد

اس غزل میں کس، بس قافیہ ہے۔ اور اس شعر میں پنجرا بروزن فاعلن کہا ہے۔ حالانکہ زبانوں پر تو پنجرا بروزن فعلن ہے مقصود شعر صرف بستنی کو باندھنا تھا اور کچھ نہیں۔ ایک یہ زمین نکالی ہے۔

سبزہ رنگوں پر لہرائے شوق کریں وہ ترنگ تو پھر
بھنگ کا کھانا سہل ہے لیکن موجیں لائیں رنگ تو پھر

عجب زمین ہے۔ اس میں شعر کہنا مشکل ہے۔ کلام موزوں البتہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھنگ کھانا محل نال ہے۔ بھنگ پینا زیادہ متعارف ہے۔

کاکلوں سے عارضی اس کا شباب آیا نظر
گھونگروں سے حسن رخ بادر رکاب آیا نظر

موت آ گئی اب آئے تو کیا دو گے تم اگر
کچھ نیند نہیں ہے کہ جگا دو گے تم اگر

ہم بھی ہیں ولولوں پہ جو وہ ہیں امنگ پر
دونوں تلے ہوئے ہیں برابر کی جنگ پر

یہ سب شعر خاص ان کے رنگ کے ہیں۔ یہ شعر کیا خوب کہا ہے:۔

دل پڑ گیا کشاکش امید و بیم میں
در پر کبھی نظر ہے کبھی پاسبان پر

مضمون رشک اکثر شعرا نے باندھا ہے، حضرت شوق فرماتے ہیں:۔

اس رشک سے لکھا نہ کبھی میں نے شوق خط
آئے گا اس کا نام قلم کی زبان پر

یہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ایسی زمینوں میں شعرائے موجودہ کو ضرور فکر کرنا چاہئے بلکہ ان کا عام رواج ہونا چاہیئے کہ قید ردیف سے آزاد ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

وارفتگی عشق میں باقی نہ رہے ہوش
ہستی مری مجھ کو ہوئی اک خواب فراموش

جس ستمگر نے کیا لاکھوں تمناؤں کا خون
یاد کرتی ہے تمنا پھر اسی کو آج کل

"کو آج کل" اس غزل کی زمین ہے۔ مگر پاکیزہ شعر نکالا ہے۔ اور فرماتے ہیں

ملنے والے چھوڑتے جاتے ہیں کچھ روحانی گر
جا رہے ہیں ہم دیار بیکسی کو آج کل

یہ بحر و کچھ چھپا نہیں۔ چند اور منتخب شعر لکھتا ہوں:۔

ظالم کی جفا کم نہ مرا درد جگر کم — ہے لاگ برابر کی اِدھر کم نہ اُدھر کم

مل کے ہوئے جو آشنا ہم سے نظر نظر سے ہم — کٹ کے ہوئے جدا جدا ہم سے جگر جگر سے ہم

وہ ترس کھا کر جو دل سے مجھ حزیں کی سی کہیں — لب نمک پروردہ ان کے ہیں انھیں کی سی کہیں

غرور جور کا پانی ہے اور کچھ بھی نہیں — یہ مقتضائے جوانی ہے اور کچھ بھی نہیں

نفس کی چال ترے گھر سے چل کے جاتے ہیں — یہیں پھر آتے ہیں جب ہم نکل کے جاتے ہیں

ہے آئینے میں بنا محو دیدار آپ ہی اب تو — وہ اپنی ناک چوٹی ہے گرفتار آپ ہی اب تو

گلیوں گلیوں ہم نے لاکھوں کنکر سے پتھر کھائے ہیں — لوگوں نے دیوانہ پاکر ناک چنے چبوائے ہیں

ان دونوں مذکورہ شعروں میں صرف دو محاورے باندھنا تھے، وہ تو بندھ گئے مگر مذاق لطیف کا خون ہو گیا۔ اور سنئے

دل ہے فریادی کہ دست ظلم کا کل ہے دراز — باندھ لو جوڑا کہ قصہ مختصر کیوں نہ ہو

یہ غزل کیا خوب کہی ہے:-

دل لے کے گئی ہے کہ جگر لے کے گئی ہے — کچھ تو مرے پہلو سے نظر لے کے گئی ہے

اللہ کرے آج نہ پلٹائے اسے یاس — امید جسے جانب در لے کے گئی ہے

باد سحری ان کو مرا حال دکھانے — سوکھا ہوا اک برگ شجر لے کے گئی ہے

ذیل کا شعر مصنف نے نکال دیا، مگر ہمیں یاد رہ گیا تھا، دیوان میں نہیں ہے۔

برچھی سے کہیں میں نے چرایا نہیں پہلو — جب آئی ہے تب لخت جگر لے کے گئی ہے

یہ غزل کیسی مشکل زمین میں ہے مگر مطلع ہی سے اس کا انداز [illegible]

روؤں اے بادل تو چل تھل بھر کے چھوڑوں نہ سہی　　تجھ کو میں پانی سے پتلا کر کے چھوڑوں تو سہی

"تو سہی" کی ردیف میں صرف اپنا کمال اور مشاقی دکھانا تھا۔ ابتذال کی حد ہوگئی

یہ شعر خوب کہے ہیں :-

ہر روز ترقی پہ جو ہے حسن کی صورت　　ایک ایک سے ملتی نہیں تصویر کسی کی

اس قافیے میں یہ شعر خوب کہا ہے اور مجھے بہت پسند آیا۔

پہنچا ہے جنوں تک اثر جوش گل ایسا　　بلبل سی چہکنے لگی زنجیر کسی کی

یہ مطلع بھی بہت پاکیزہ کہا ہے۔

کیا قیامت ہے کہ چڑھتا ہے نہیں ہے کوئی　　روز اک دل انہیں دیے لا کے کہیں سے کوئی

گر پڑا ہاتھ سے آئینہ یہ ہم نے دیکھا　　پوچھے اب اُن کے تحیر کو انہیں سے کوئی

ان بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھ لیا　　کہ فلک سے ہے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لئے ہوئے　　میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے

زلفوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر　　بیٹھے رہو گے دردِ وہ سر میں لئے ہوئے

دوسرے مصرعے میں "درد کو" تھا پھر مصنف نے "دردِ وہ" بنایا لیکن حقیقت

یہ ہے کہ "کو" اور "وہ" دونوں برائے بیت ہیں۔ ذیل کا شعر کیا خوب کہا ہے حالانکہ

زمین بہت مشکل ہے۔

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے　　ارے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے

دیکھنا اس کا نہ ہو اے شوق اگر مد نظر　　آنکھ میں پتلی تو پتلی میں نظر ہی کیوں بنے

بچپن میں جو اڑاتے تھے گل پر لیے ہوئے　　سر آج اڑا رہے ہیں وہ خنجر لیے ہوئے

قد جو اوروں سے ہے نیچا تو نہ شرماؤ تم　　تاڑ سے باغ میں نخل گل تو نیچا ہے

دونوں شعر ابتذال ذوق کے گواہ ہیں اور ذیل کے شعر خوب ہیں۔

ہماری جان وہ کیا لیں جو بن میں جب ہو بھی　　بدن بھی کھل کے مٹا پیرہن میں جب ہو بھی

غالباً اہل زبان ایسی جگہ جب ہو بھی کی جگہ ہو بھی اب کافی اور فصیح سمجھتے ہیں

دراز دستی زلف رسا کے ہم قائل　　مگر کہاں دل وحشی بدن میں جب ہو بھی

چھری کے وار پہ منہ سے دعا نکلتی ہے　　کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلتی ہے

بتاؤں کیا شب فرقت میں سانس کی گت　　تمام رات چھری سی جگر پہ چلتی ہے

ہوا نہ بگڑے کہاں تک دیار الفت کی　　تری زبان تو ہر وقت زہر اگلتی ہے

ہوا ہو، چاہے زمانہ ہو چاہے رنگت ہو　　زیادہ سب سے تمھاری نظر بدلتی ہے

مذکورہ غزل کیا خوب کہی ہے مشکل زمینوں میں دو تین شعروں کی اور زحمت دیجیے

تیر کو کیوں دوں کہ جس رخ جائے وہ دل لے کے جائے　　دوں نظر کو جو پھرے اور سوئے قاتل لے کے جائے

جھڑکیاں ان کی سہوں میں تو ممکن ہے مگر　　مسکراہٹ کیوں نہ دیں غصہ اتر کیوں نہ جائے

یہ جناب شوق قدوائی مرحوم کے رنگ تغزل پر ایک بسیط نظر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ مگر زمانے کی بد مذاقی بہا لے گئی اور پھر ایسا رنگ چڑھا کہ طبیعت ثانیہ بن گیا۔ ورنہ وہ صرف بیانیہ نظموں کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کی بہت سی نظمیں بے مثل ہیں، بہت مقبول ہیں گو مسلسل نہیں

شامل ہیں، اور ارباب ذوق شوق سے پڑھتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان کے بلند اقبال
صاحبزادے شیخ طاہر علی اور داماد لائق شیخ رضی الدین صاحب بیرسٹر ان کی نظموں
کو بھی اسی شان اور اہتمام سے جلد چھپوا دیں گے اور مقدمے ہیں جو کمی رہ گئی ہے
وہ پوری ہو جائے گی تاکہ اس بلند پایہ شاعر کی اصلی کاوش فکر کے نتائج سے دنیا
محروم نہ رہے اور یوں دیوان کے مطالعے کے بعد ناظرین مایوس نہ ہوں بلکہ اس
کوفت کی پوری تلافی ہو سکے ۔

اردو لٹریچر

مؤلفہ ڈاکٹر گراہیم بیلی، ڈی، لٹ، بی ڈی، ایم، اے۔ ریڈر ہندی
واردو، لندن یونیورسٹی (   )

صفحات ۱۰۷ قیمت دو روپے

ڈاکٹر بیلی زمانہ حال کے اُن چند انگریزوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے قیام ہندوستان میں علاوہ فرض منصبی کے اپنا وقت ہندوستان کی بعض زبانوں کی تحصیل و تحقیق میں صرف کیا اور اس کے بعد بھی اپنے شوق کی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں کلیسائے اسکاچستان کے تعلق سے ان کا قیام پنجاب میں رہا۔ پنجابی، ہندی اور اردو زبان بخوبی جانتے ہیں۔ اس سے قبل انگریزی پنجابی لغت، نیز ہمالیہ پہاڑ کی لسانیات اور پنجابی صرف و نحو پر ان کی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب (اردو ادب کی تاریخ) ان کی آخری تالیف ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اردو زبان سے خوب واقف ہیں اس لیئے زمانہ حال میں اردو کی تاریخ و تحقیق کے متعلق جو کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں یا جو مضامین اس تحقیق کے متعلق اردو کے رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں ان سے انھوں نے اپنی اس تالیف میں حتی الامکان پورا

استفادہ کیا ہے۔ اور سو صفحے کے اندر اردو زبان کی پوری تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ ابتدائی زمانے کے بعض ایسے مصنفوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو غالباً کسی بڑی تاریخ میں بھی قابل ذکر نہ سمجھے جاتے۔

ابتدائی اردو کے ابواب کے ماخذ زیادہ تر پنجاب میں اردو، قدیم اردو، اردو شہ پارے اور رسالہ اردو کے وہ مضامین ہیں جو اس رسالہ میں ابتدائی اردو سے متعلق وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے قابل شاگرد (مؤلف شہ پارے) کی طرح "بقول ایک نقاد کے، رسالہ اردو کے مضامین کے حوالہ دینے کی دقت گوارا کی ہے" جہاں تک ابتدائی اردو کا تعلق ہے، اردو کی تقسیم میں "اردوئے قدیم" کا اتباع کیا ہے۔ ابتدائی دور پر کتاب کا بڑا حصہ صرف ہو گیا ہے باقی حصہ اتنا تفصیلی نہیں۔ پوری کتاب کے مضامین کی تقسیم یہ ہے۔

مختصر دیباچے کے بعد جس میں اردو شعر کی بحروں، شعر کے اقسام اور اعلیٰ اور نامی شعرائے اردو کے اسماء ہیں۔ پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں اردو کی ابتدا اردو کے نام اور زبانوں میں اردو کی حیثیت سے کی ہے۔ دوسرے باب میں ابتدائی اردو کی تاریخ ہے جس میں صوفی اور عالم شعرا، قطب شاہی اور عادل شاہی زمانوں کے شاعروں، دکن میں مغلوں کے عہد کے مصنفوں اور آخر میں ولی کے نوجوان ہم عصروں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں دہلی کی شاعری کی پہلی صدی کا حال ہے

جس میں حاتم، مظہر، سودا، میر، درد، میر حسن، مصحفی، انشا، اثر، نظیر، نصیر آگئے ہیں چوتھے باب میں انیسویں صدی کے لکھنوی شاعر ہیں یعنے خلیق، ضمیر، شہیدی، دیا شنکر نسیم، آتش، ناسخ، شرف، صفا، وزیر، رند، رشک، برق، مہر، بحر، خلیل، آباد، اختر، (واجد علی شاہ) قلق، ذکی، درخشاں، اختر، انیس، دبیر، مونس، شوق، عشق، نفیس، رشید، عارف، پانچویں باب میں دہلی کے دوسرے عہد اور رام پور کے چار شاعروں کا ذکر ہے، اس میں ذوق، غالب، مومن، ظفر، نسیم، تسکین، شیفتہ، آزردہ، سالک، درخشاں، ثاقب، تاباں، سائل، زکی، ظہیر، انور، مجروح اور (رام پور کے چار شاعر) امیر، داغ، تسلیم، جلال ہیں چھٹا باب اردو نثر پر ہے جس میں چند ابتدائی نثاروں، فورٹ ولیم کالج کے مترجمین اور انیسویں صدی کے ارباب نثر کا تذکرہ ہے ساتواں باب عہد جدید کے شعرا پر ہے جس میں حالی، آزاد، محمد اسمٰعیل، اکبر، سرور، نادر، محسن، شاد، عظمت اللہ خاں ہیں۔ آٹھواں اور آخری باب چار صفحے کا خاتمہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اردو نظم و نثر پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکاڈیمی، عثمانیہ یونیورسٹی اور دار المصنفین کا سرسری ذکر اور اقبال پر مختصر تبصرہ ہے۔

اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے ذکر سے جنہیں شاعر کہنا بد ذوقی کی دلیل ہے، زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا

عجیب بات یہ ہے کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کر دیا ہے جن کے مصنف نام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیر معروف اور ناقابل لحاظ شاعروں کے نام گنائے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ ہر عہد کے ایسے نامی شعرا کو لیتے جن کا اردو شاعری میں خاص درجہ ہے اور جنھوں نے اردو شاعری اور شعر پر اپنا اثر قائم کیا تھا اور اس عہد اور پھر اس عہد کی خصوصیات کو کسی قدر زیادہ تفصیل اور بصیرت سے بیان کرتے۔ اس قسم کی مختصر کتابیں جو بڑی تذکروں اور لاحاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ردی فہرست ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے چند مباحث کے متعلق ذاتی جدت کا دعویٰ کیا ہے۔ مثلاً (۱) اردو کی ابتدائی تاریخ کی ابتدا اور اصل (۲) اردو میں دکنی کی اہمیت اور دکنی شعراء کا ذکر (۳) تحسین کی نوطرز مرصع، میر امن کی باغ و بہار اور امیر خسرو کی چہار درویش کے متعلق جدید معلومات۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے اس جدت کی ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ نمبر (۱) کلکتا پروفیسر شیرانی کی محققانہ تالیف "پنجاب میں اردو" سے ماخوذ ہے۔ نمبر (۲) رسالۂ اردو کے مضامین، اردوئے قدیم یا ان دونوں کے خوشہ چینوں سے منقول ہے۔ نمبر (۳) راقم کے مقدمۂ باغ و بہار کا رہین منت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ چیزیں اب تک انگریزی زبان سے روشناس نہیں ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لیئے اُن سے جگہ جگہ، خصوصاً ابتدائی دو رین جسے وہ اپنا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ ان لغزشوں کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو نقل در نقل ہونے سے، دوسرے ایسے ماخذوں سے استفادہ کرنے سے جو ناقابل اعتبار ہیں۔ تیسرے ایسے ماخذ جن سے انہوں نے رجوع کیا ہے وہ ہیں تو قابل اعتماد لیکن کاتب کی غلطی سے بعض الفاظ یا نام غلط چھپ گئے ہیں اور ویسے ہی نقل کر دیے ہیں اور چونکہ فاضل مولف نے ایسے مقامات پر حوالہ دینے سے احتراز کیا ہے اس لیے وہ سب غلطیاں انہیں پر نصب ہو گئی ہیں ہم یہاں صرف چند موٹی موٹی غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قصۂ ابو شحمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا۔ بلکہ ہر نسخے کے آخر میں اس کا نام "اولیا" لکھا ہوا ہے۔ (صفحہ ۲۶)

(۲) ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امیر خسرو کی یوسف زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف سے کوئی مثنوی یوسف زلیخا ہے۔ (صفحہ ۲۸)

(۳) ہاشمی کی دو تصانیف بتائی ہیں۔ ایک یوسف زلیخا اور دوسری

"احسن القصص" یہ غلطی بچوں کی سی ہے۔ یوسف زلیخا کے قصے ہی کو
احسن القصص کہا گیا ہے۔ یہ دو کتابیں نہیں ایک ہی کتاب ہے۔ اس میں
ڈاکٹر صاحب کا قصور نہیں۔ انہوں نے بلفظہ یہ عبارت "اردو شہ پارے" سے
نقل کی ہے۔ البتہ تعجب مولف "اردو شہ پارے" سے ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا
مسلمان بلکہ اکثر ان پڑھ مسلمان بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں یوسف زلیخا کے
قصہ کو احسن القصص کے نام سے یاد کیا ہے۔ (صفحہ ۳۰)

(۴) مصنف قصۂ ملکۂ مصر و قصۂ فیروز شاہ کا نام "محمد علی عاجز" غلط ہے۔ اس نے
خود اپنی تصنیف ملکۂ مصر میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔ عاجز تخلص بھی غلط ہے
چنانچہ وہ کہتا ہے۔

اے محمود اب پیر کا ناؤں لے   ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

یہ غلطی "اردوئے قدیم" سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے۔ (صفحہ ۳۰)

(۵) عارف الدین عاجز کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے ہمنام (عاجز) کی ایک تصنیف
اس سے منسوب کر دی گئی ہے۔ یہ غلط ہے۔ عاجز اورنگ آبادی کی کوئی
تصنیف کسی دوسرے دکنی عاجز سے منسوب نہیں کی گئی۔ مصنف کو مغالطہ
ہوا ہے یا کسی کتاب کی عبارت کو غلط سمجھ کر یہ لکھ دیا ہے۔ (صفحہ ۳۲)

(۶) شاہ بیر اللہ حجری کی تصنیف (منظوم سب رس) کا نام "گلشن حسن دل"
لکھا ہے۔ اس کا اصل نام "گلشن حسن دل" ہے۔ راقم نے اس کتاب کا

ذکر اپنے ایک مضمون (رسالۂ اردو) میں کیا ہے۔ کاتب نے غلطی سے "حسن" کی بجائے "حسن" لکھ دیا۔ مولف شہ پارے نے وہی غلط نام اپنی کتاب میں (بغیر حوالہ) نقل کر دیا اور ڈاکٹر سبلی نے نقل در نقل کتاب استاد شاگرد دونوں نے نہیں دیکھی، حوالہ دیتے نہیں، غلطی معلوم ہو تو کیونکر (صفحہ ۳۲)

یہی کیفیت ہمیں دوسرے شعرا و مصنفین کے حالات میں نظر آتی ہے مثلاً محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر تفصیلی رائے، اس کے اشعار اور صفحات کی تعداد نہایت وثوق کے ساتھ دی گئی ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے شریک جرم نے محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی صورت تک نہیں دیکھی۔ اور یہ سب تفصیلات ان دونوں صاحبوں نے لفظ بلفظ رسالۂ اردو کے مضمون سے نقل کی ہیں لیکن حوالہ دینا ان کے مذہب میں روا نہیں۔ یہ تحقیق کا نیا گر ہے یہی حال ہم شمس العشاق، برہان جانم، ذوقی وغیرہ کے حالات میں دیکھتے ہیں۔ اسے تحقیق تو نہیں البتہ الہام کہہ سکتے ہیں یا ابو طالب طالب قصبۂ بلنڈہ کے باشندے تھے مہر حسن اور قائم نے بھی یہی لکھا ہے کہ بلنڈہ من مضافات اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے حیدر آباد لکھ دیا ہے۔ (صفحہ ۳۲)

شاہی دو ہیں ایک علی عادل شاہ شاہی اور دوسرے شاہ قلی خاں شاہی۔ دونوں کے مرثیے قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں جن کو غلطی سے

ایک دوسرے سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ شاہ قلی خان بھاگ نگر حیدر آباد کے تھے، بھاؤنگر غلط ہے۔ (صفحہ ۲۷)

(۹) نورس کی زبان دکھنی نہیں ہندی ہے۔ یہ بھی اردو شہ پارے کی غلط نقل کا نتیجہ ہے۔ (صفحہ ۲۷)

(۱۰) وجدی کی تصنیف تحفۂ عاشقین نہیں تحفۂ عاشقان ہے۔ تعجب ہے کہ اس کی سب سے مشہور و معروف تصنیف "پنچھی باچا" کا ذکر نہیں جو بار ہا چھپ چکی ہے (صفحہ ۳۳)

(۱۱) فیض عام کے مصنف کا نام سید محمد نہیں بلکہ عبد المحمد ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے

رکھا زبان اس کا نفین فیض عام — کیا ہے جو دکھنی زبان میں کلام

ابی مجتبیٰ مہتدی مہدوی — یہ عبد المحمد جو ہے مہدوی

(صفحہ ۳۷)

(۱۲) قیاسی کا صحیح نام سیدی عبد اللہ ہے سید عبد اللہ غلط ہے۔ (صفحہ ۳۷)

(۱۳) آرزو کی تصنیف "نوادر الفرض" نہیں بلکہ "نوادر الالفاظ" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے "غرائب اللغات" کو بھی آرزو سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ یہ عبد الواسع ہانسوی کی تصنیف ہے۔ (صفحہ ۳۹)

(۱۴) جرأت کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے زیادہ نہیں لکھا۔ حالانکہ اس کا کلام بہت ضخیم ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا۔ (صفحہ ۵۶)

(۱۵) سوز کے متعلق بھی یہی غلطی کی ہے۔ اس شاعر کا کلام بھی بہت ضخیم ہے مگر چھپا نہیں۔ سوز کے متعلق دوسری غلطی یہ کی ہے کہ دہلی سے ان کا جانا سنہ ۱۷۷۷ء میں لکھا ہے حالانکہ وہ اس سے بہت قبل جا چکے تھے۔ سودا کے ساتھ فرخ آباد میں مہربان خان کے ہاں تھے۔ سودا نے فرخ آباد سنہ ۱۷۷۵ء میں چھوڑا سودا کا قیام سترہ اٹھارہ سال فرخ آباد میں رہا، اس عرصے میں وہ فرخ آباد ہی میں تھے۔ اس لحاظ سے سوز ۱۷۵۷ء کے لگ بھگ دہلی سے فرخ آباد آگئے تھے (صفحہ ۵۱)

(۱۶) مصحفی نے ایک نہیں بلکہ تین تذکرے لکھے ہیں۔ دو ریختہ گو اور ایک فارسی گو شعراء کا۔ (صفحہ ۵۳)

(۱۷) سودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ حالانکہ دہلی ہی میں سنہ ۱۱۶۵ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا، میر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۸) سودا کے غلام "غنچہ" کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں۔ صرف آزاد نے لکھا ہے ڈاکٹر صاحب نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں اس کا ذکر خیر فرمایا ہے۔

(۱۹) "قائم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سب سے بڑی کامیابی رباعی گوئی میں ہے ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ لکھا ہے کہ اس کا کلام سنہ ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔ یہ بھی صحیح نہیں۔

(۲۰) دیا تشنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کے متعلق لکھا ہے کہ یہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے بہت مشابہ ہے۔ یہ رائے بہت ہی حیرت انگیز ہے۔

نسیم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے الف لیلہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اس غلطی کا ارتکاب گارساں دتاسی نے کیا ہے اور اس کی نقل ڈاکٹر صاحب نے کی ہے۔

(۲۱) میر اور سودا کے دور کے دو مشہور شاعروں کا ذکر بالکل ترک کر دیا ہے۔ حالانکہ بہت سے غیر معروف اور کم سواد شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک سید عبدالولی عزلت ہیں جو صاحب دیوان ہیں اور ان کی تصنیف سے "راگ مالا" ایک مشہور مثنوی ہے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں ان کی بیاض سے بہت مدد لی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی بہت تعریف کی ہے۔

دوسرے فقیہ دردمند شاگرد مظہر ہیں۔ ان کا ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔ خود مظہر جان جاناں نے اپنے ایک شعر میں ان کی تعریف کی ہے۔ اساتذہ وقت نے ان کے ساقی نامہ کو بے مثل تسلیم کیا ہے۔

(۲۲) عبدالحی خاں صارم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آصف جاہ کا پہلا وزیر تھا ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ شاعر تھا اور جوان فوت ہوا۔ آصف جاہ کا پہلا وزیر صارم کا باپ عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہ نواز خان مولف مآثر الامرا و بہارستان سخن تھا۔

(۲۳) ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد نے بے نظیر کے نام (یا عنوان) سے چند نظمیں لکھی ہیں ۔ یہ بات نہیں ہے بلکہ سید افتخار عالم مرحوم نے ان کی نظموں کا مجموعہ نظم بے نظیر کے نام سے شایع کیا تھا ۔ اس تبصرے میں ہم نے ان کی بعض رایوں سے بحث نہیں کی جو انہوں نے بعض شعرا کے متعلق ظاہر کی ہیں، ان میں سے اکثر وہ ہیں جو دوسری جگہ سے منقول اور ماخوذ ہیں اور بعض ان کی ذاتی ہیں، ورنہ یہ بحث بہت طویل ہو جاتی ۔

ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ قابل قدر اور اہم تھا فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر صرف فسانوں اور قصہ کہانیوں تک رہا مگر دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا ۔ اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا

ایک انگریز اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ہے کہ اہل ہند ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ امر پیش کیا ہے کہ یہ لوگ ہمیں (انگریزوں کو) طنزاً "گورا" (یعنے گھوڑا) یا گھڑمنہا کہتے ہیں ۔ یورپی شخص کی زبان سے گھ اور ڑا کا تلفظ ادا نہیں ہوتا اور وہ گورا اور گھوڑا کو ایک ہی طرح بولتا ہے ۔ اس سے یہ منغالطہ ہوا یہی حال ان یورپی محققین کے ہاتھوں "کھڑی بولی" کا ہوا ۔ یہ لوگ "کھڑی اور کھری" میں فرق نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کھڑی کے معنے کھری اور کھڑی بولی کے

معنے پاک صاف، نشستہ اور عام مستند زبان سمجھتے رہے ہیں۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مغالطہ کو رفع کیا ہے

لیکن اصل غلطی میں یہ بھی مبتلا ہیں۔ کھڑی اور کھری کا فرق انہوں نے بہت صحیح بتایا ہے لیکن معنے تقریباً وہی رکھے ہیں جو کھری کے ہیں یعنی مروجہ علم مستند (Standard) زبان اور دوسرا غضب کیا ہے کہ "کھڑی بولی" کو ایک خاص زبان قرار دیا ہے اور اس کی دو شاخیں بتائی ہیں ایک ہندی اور دوسری اردو۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ہے جس قدر ان کے پیشرو یورپی محققین کا۔ کھڑی بولی کے معنے ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جیسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔

باوجود ان نقائص اور اختلافات کے ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں پہلی تالیف ہے جس میں مختصر طور پر اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ابتدا سے اب تک جو جو تغیرات اور ترقی عہد بعہد زبان میں ہوتی ہے لسے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ زبان کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے طلبہ اور خاص کر ان لوگوں کے لیے جو انگریزی میں اردو ادب کی اجمالی کیفیت جاننا چاہتے ہیں یہ کتاب ضرور کار آمد ہے۔

نور اللغات

ابتدا میں اردو لغت کی کتابیں اہل یورپ اور خاص کر انگریزوں نے لکھیں
جن میں ڈاکٹر ہنٹر۔ ڈاکٹر ہیرس۔ ڈاکٹر گلکرسٹ۔ ڈاکٹر فوربس۔ جان شیکسپیئر۔ ڈاکٹر فیلن
اور پلیٹس کی زیادہ مشہور ہیں۔ اہل زبان نے اس طرف بہت بعد میں توجہ کی اور
حیرت کی بات ہے کہ اہل زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابل التفات ہیں البتہ
مولوی سید احمد مرحوم کی کتاب فرہنگ آصفیہ ایسی ہے جو مکمل اور مستند کہی جا سکتی ہے
اگرچہ وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے لیکن اس میں شک
نہیں کہ مرحوم نے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور اس سے ملک کو
بیحد فائدہ پہنچا اردو زبان کو ابھی صحیح مستند اور مکمل لغت کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے
کوئی زبان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور جس زبان میں اعلیٰ درجہ کی محققانہ لغت
کی کتابیں نہیں ہیں وہ زبان مہذب نہیں کہلا سکتی۔ ہمیں اس سے حقیقی مسرت
ہوئی کہ مولوی نور الحسن صاحب نیر ایک مدت سے اردو لغت کی ترتیب اور تکمیل
میں مصروف ہیں اور اس وقت اس کا پہلا حصہ جس میں پہلے دو حرف الف اور
بے ہیں چھپ کر شایع ہو گیا ہے۔ اس میں ہر لفظ پر تفصیل سے بحث کی ہے چنانچہ

یہ حصہ بڑی تقطیع پر (۴۱۰) صفحے پر ہے۔ مؤلف کی محنت اور تحقیق قابل داد ہے جہاں تک ممکن ہوا ہے ہر لفظ کی اصل بھی ساتھ ساتھ لکھ دی ہے۔ ہماری لغت کی کتابوں میں ہندی الفاظ کی طرف سے عموماً بے توجہی کی گئی ہے لیکن اس لغت میں اکثر ہندی الفاظ کا مادہ بتا دیا گیا ہے اور ہر لفظ کے تحت میں اس کے محاورات تفصیل کے ساتھ دئے ہیں اور ہر لفظ اور ہر محاورے کے لئے مستند شعرا اور اہل زبان کے کلام سے سند بھی بیان کر دی ہے۔ اس میں ہمارے لغت نویسوں نے بہت افراط سے کام لیا ہے۔ ہر لفظ کے لئے سند میں شعر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لغت میں بھی اس کی پیروی کی گئی ہے مثلاً بڑ (برگد) کے لئے انشا کے شعر کی ضرورت نہ تھی ہمارے لغت نویسوں نے صرف تحریری زبان کو پیش نظر رکھا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بول چال کی زبان ہر حصے میں اس قدر مختلف ہے کہ ہر مقام کے الفاظ لغت میں لکھنا ممکن نہیں۔ لیکن کیا یہ درست نہ ہوگا کہ اگر کوئی لفظ کسی مقام پر ایسا بولا جاتا ہے جس کا مترادف دلی لکھنؤ کی زبان میں نہیں پایا جاتا تو اُسے لغت میں داخل کر لیا جائے؟ یہ امر ان صاحبوں کے لئے قابل غور ہے جو اپنی زبان کی لغت لکھنا چاہتے ہیں۔

جب دو یا دو سے زائد الفاظ مل کر ایسی ترتیب سے استعمال ہوں جو اہل زبان بولتے ہیں اور اس میں کسی قیاس یا تغیر و تبدل کو دخل نہ ہو یا جب یہ ایسے معنے پیدا کریں جو حقیقی معنوں سے الگ ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے لیکن جب یہ عام

حقیقی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ نہیں کہلاتا۔ مثلاً فاضل مؤلف نے بڑا کی تحت میں بڑا نکیلا ہے۔ بڑا ہی سخت ہے۔ بڑا تقدیر والا ہے۔ وغیرہ جو محاورے لکھے ہیں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں بڑا بطور صفت یا تمیز کے نکیلا سخت اور تقدیر والا کے ساتھ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کوئی خاص معنے پیدا نہیں کرتا۔ ورنہ اگر اس قسم کے جملے اور الفاظ لکھنے کا التزام کیا جائے تو کتاب اس قدر ضخیم ہو جائے گی کہ اس کے لئے بیسیوں مجلدات کی ضرورت ہو گی۔ اسی طرح آپ کی شکایت میرے سر آنکھوں پر۔ آپ کا منہ ہے وغیرہ۔ جو محاورے لکھے گئے ہیں ان کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ آیا محاورے آپ کے تحت میں آنے چاہئیں یا نہیں کیونکہ یہ محاورے صرف "آپ" سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دوسری ضمیروں اور اسموں کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں پہلا محاورہ "سر آنکھوں" اور دوسرا "منہ" کے تحت میں آنا چاہیئے

ہندی یا کسی دوسری زبان کا غیر مانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اہل زبان ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے جائز نہیں خیال کرتے لیکن عربی، فارسی اس قید سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ مصنفین ثقیل سے ثقیل اور غیر مانوس عربی فارسی لفظ بے تکلف اپنی تحریروں میں استعمال کر جاتے ہیں اور شعراء تو قصائد میں بالکل آزاد ہیں۔ اس نظر سے اگر عربی فارسی کے لفظ اردو لغت کی کتابوں میں داخل کئے جائیں تو عربی فارسی کے لغات نصف سے زیادہ اردو کی لغت میں آ جائیں گے۔

ال کے طور پر لفظ "استفتار" ہے جو فاضل مولف نے اس لغت میں لکھا ہے اور
میں "نوازش" کا شعر تحریر فرمایا ہے۔ یہ لفظ اردو زبان کے لئے بالکل غیر مانوس ہے
ہم نے اردو تحریروں میں کہیں اس کا استعمال نہیں دیکھا اور اردو تو اردو عربی
سی میں بھی شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔ نوازش کا شعر اس کے لئے سند نہیں
سکتا۔ ہماری رائے میں اردو لغت میں عربی فارسی کے صرف وہی الفاظ داخل
نے چاہئیں جو یا تو اردو زبان میں خاص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یا عام
چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ خاص الفاظ کے لئے عربی فارسی کی لغت کی
ہیں موجود ہیں۔

کتاب کے دیباچے میں لائق مولف نے متروکات کی ایک فہرست دی ہے
وکات کا مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک
ئے ہیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کئے۔ ان کے شاگردوں نے بھی اس
تقلید کی اور اس طرح متروکات کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہماری رائے میں کسی
ص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے۔
اظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے۔ بڑھتے گھٹتے ہیں۔ صورت بدلتے
حیثیت میں فرق آجاتا ہے۔ بعض نام پیدا کرتے ہیں بعض گمنام ہو جاتے ہیں
یل سے شریف اور شریف سے رذیل ہو جاتے ہیں اور بعض ایک مدت کے
مر جاتے ہیں لیکن دانستہ گلا گھونٹنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ تعجب ہے کہ

اِس کی ابتداء شعراء کی طرف سے ہوئی۔ حالانکہ شاعری کو ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ الفاظ کلام میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ (لیکن کے معنوں میں) متروک بنایا جاتا ہے۔ نثر میں متروک ہو تو ہو لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نظم میں متروک کر دیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے اور ہر لحاظ سے لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اسے بلا تکلف استعمال کر سکتا ہے۔ بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کے بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شئے بغیر ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "پرے" کا لفظ بھی متروک ہے۔ لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "اُدھر" مگر پرے اور اُدھر کے معنوں میں بہت فرق ہے اُدھر سمت کو بتاتا ہے اور پرے بعد کا اظہار کرتا ہے "مت" بھی متروک سمجھا گیا ہے حالانکہ اس کے معنے خاص ہیں "نہ" "یہ کام نہیں دے سکتا" "نہ" افعال کی علم نفی کے لئے ہے اور "مت" نہی کے واسطے مخصوص ہے۔ اسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر۔ سو۔ تو۔ ناؤ۔ منہ جانا۔ بھلا (بمعنے اچھا) کا نٹھ وغیرہ وغیرہ متروک قرار دئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے ان کا لکھنا ترک کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بحث طویل ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

انشاء اللہ آیندہ کسی وقت اس پر علیحدہ بحث کیجائے گی۔ الفاظ کے اعراب کا
جو طریقہ لائق مؤلف نے اختیار کیا ہے اس میں کسی قدر تکلف اور دقت ہے۔
آج کل جو طریقہ رائج ہو گیا ہے وہ زیادہ آسان ہے۔

ہم فاضل مؤلف کو اس کوشش اور محنت پر جو انہوں نے اس کتاب کی تالیف
میں برداشت کی ہے مبارک باد دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب موجودہ
لغت کی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور بعض وجوہ سے سب میں بہتر ہے
ہمیں امید ہے کہ اس کا کام جاری رہیگا اور جلد تکمیل کو پہنچے گی ایسی کتابوں کی
ملک کو بہت ضرورت ہے۔

مؤلف سے نیر پریس پاٹانالہ لکھنو سے مل سکتی ہے۔

جامع اللغات اردو

والسنہ متعلقہ

حصہ اول و دوم ۔ مرتبہ خواجہ عبدالمجید صاحب بی اے ۔ جامع اللغات کمپنی لاہور

قیمت فی حصہ ایک روپیہ چار آنہ

لائق مولف و مرتب نے اتنا بڑا کام اپنے سر لیا ہے کہ اس کا نباہنا بہت مشکل ہے ۔ انہوں نے صرف اردو تک اس کام کو محدود نہیں رکھا بلکہ السنہ متعلقہ کو بھی لے لیا ہے جس سے ان کی دشواری بہت بڑھ گئی ہے ۔ اول اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ السنہ متعلقہ میں سے (جو متعدد ہیں) کس قسم کے اور کون کون سے لیے جائیں ۔ اگر یہ امر طے نہ کیا جائے تو پھر عربی فارسی سنسکرت وغیرہ زبانوں کا ہر لفظ داخل ہو سکتا ہے ۔ یہ مرتب کی مرضی پر ہے کہ جسے چاہے داخل کرے ۔ اور جسے چاہے چھوڑ دے ۔ لغت نویس زبان کا بنانے والا نہیں ہے بلکہ زبان کا تابع ہے ۔ وہ صرف انہیں الفاظ کی تشریح کرتا ہے جو زبان میں آ گئے ہیں ۔ اس امر کو ملحوظ نہ رکھنے سے یہ کتاب عجیب و غریب ہو گئی ہے ۔

اس کتاب میں دو باتوں سے بالکل بحث نہیں رکھی۔ ایک الفاظ کے اصل
کی تحقیق، دوسرے استعمال کی سند۔ الفاظ کی اصل کی تحقیق نہایت مشکل کام ہے
اور اس سے خاص خاص لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ عام لغت میں اگر اس سے
قطع نظر کی جائے تو کوئی زیادہ حرج نہیں لیکن استعمال کی سند نہ دینا بہت بڑا نقص
ہے خصوصاً جہاں معانی میں نازک فرق ہوتے ہیں یا ایک ہی لفظ مختلف معنو
میں مختلف طرح استعمال ہوتا ہے یا بعض محاورے خاص انداز یا خاص خاص
موقعوں پر ہوتے ہیں ان کے استعمال کی سند مستند مصنفین کے کلام سے دینا
لازم ہے۔ محض مختصر طور سے تشریح کر دینے یا معنے لکھ دینے سے اصل مفہوم کبھی
سمجھ میں نہیں آتا۔ بالفرض اگر سمجھ میں آبھی جائے تو بھی ایسی صورتوں میں لغت
نویس کا لکھنا سند نہیں ہو سکتا اور لغات کار آمد نہیں ہو سکتی بلکہ بعض اوقات
گمراہ کر دیتی ہے۔ معنی کی صحیح تشریح ہمیشہ استعمال کی مثالوں سے ہوتی ہے اور
یہ لغت کا اہم جز ہے۔ قابل مولف اس سے بے خبر نہیں ہے لیکن محض اس اندیشہ
کہ کتاب ضخیم نہ ہو جائے انہوں نے اسناد ترک کر دیں۔ ہماری رائے میں یہ اچھا
نہیں کیا کہ اس سے کتاب کا فائدہ بہت کم ہو گیا ہے۔ البتہ یہ وعدہ کیا ہے
کہ اگر خریداروں نے پسند کیا تو ہم بعد کو اسناد کی زائد جلدیں مرتب کر دیں گے
اس سے مطالعہ کرنے والوں کو اور الجھن پیدا ہوگی۔ ان کا یہ کہنا کہ فی الحال
ضرب الامثال اسناد کا فائدہ دے سکتی ہیں صحیح نہیں۔ ضرب الامثال کو اس سے

کوئی تعلق نہیں۔

الفاظ کی تشریح و تعریف میں بھی بعض جگہ بے احتیاطی ہو گئی ہے "آویزہ" کے معنے لکھے ہیں "وہ شخص جو آویزے پہنتا ہو" یا "آل و اطفال" کے معنوں میں ایک معنے "کل خاندان" بھی ہیں۔ "آہ نہ کرے" کا ایک محاورہ لکھا ہے اور اس کے معنے "وہ بے رحم آدمی . . . . . " ہیں۔ "آہ نیم شب" "وہ جو آدمی رات کو نکلے"۔

محاورات کے سمجھنے میں بھی بعض مقامات پر غلطی ہو گئی ہے۔ صرف چند مثالیں نمونے کے طور پر لکھی جاتی ہیں۔

"آپ ہر فن مولی ہیں" ہر فن مولی بے شک محاورہ ہے مگر اس محاورے کو "آپ" سے کوئی خاص تعلق نہیں، ہر ضمیر اور ہر شخص کے ساتھ آسکتا ہے۔ اگر یہ اصول رکھا گیا تو جگہ جگہ اسے لکھنا پڑے گا۔

"آج کل جنگل میں سونا اچھالتے چلے جاؤ کوئی نہیں پوچھتا" اس سے محاورے کو "آج کل" سے کوئی تعلق نہیں۔ "آج کل" اس محاورے کا جز نہیں ہے۔

"آدھی ٹولی" نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔ آدھا اور آدھی اکثر چیزوں کے ساتھ آتا ہے۔ ٹولی کے ساتھ "آدھی" کا لفظ کوئی خاص معنی پیدا نہیں کرتا۔ "آوازِ قدم" کوئی محاورہ نہیں۔ اس طرح کے الفاظ اور جملے اگر لکھنے ہیں تو روزمرہ کا کوئی جملہ بھی نہ چھوٹے گا۔ یہ غلطی محاورہ کے صحیح معنے

نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔

"آنکھوں کا ڈھونڈھنا" کوئی محاورہ نہیں۔ "آنکھوں کا کسی کو ڈھونڈھنا" ہونا چاہیئے تھا۔ آنکھیں استاد سامری ہونا" کوئی محاورہ نہیں۔ یہ محض تشبیہ ہے

اس قسم کی بیشتر غلطیاں اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ دوسری لغت کی کتابوں کو سامنے رکھ کر نقل کرلی ہے اور ان کی صحت اور غلطی کو تحقیق نہیں کیا۔ اور اسی نقل و تقلید کی وجہ ہے کہ سینکڑوں ہزاروں لفظ جو بول چال میں آتے ہیں یا مختلف پیشوں اور علوم و فنون سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں نہیں پائے جاتے۔

ہمارا مقصد اس تبصرے سے قابل مؤلف کی محنت کی تنقیص کرنا نہیں۔ ہم ان کی محنت اور خاص کر ان کی ہمت کی داد دیتے ہیں۔ یہ دو چار باتیں صرف اس لیے لکھ دی گئی ہیں کہ اگر مناسب خیال کریں تو آیندہ اوراق میں اس کا خیال رکھیں۔

قابل مؤلف نے یہ اہتمام کیا ہے کہ بالالتزام ہر مہینے ایک حصہ شائع کیا جائے اور تیس مہینوں میں کتاب ختم کر دی جائے۔ اس وقت تک دو حصے شائع ہو چکے ہیں کاغذ اور چھپائی بہت خوب ہے۔ البتہ اعراب دینے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ اعراب کے جو قواعد مقرر کیئے گئے ہیں وہ بھی مکمل نہیں، ان میں ترمیم اور اضافے کی ضرورت ہے۔

تالیف میر قدرت اللہ قاسم مرتبۂ پروفیسر محمود شیرانی۔ شایع کردۂ پنجاب یونیورسٹی
موتی لال بنارسی داس تاجر کتب لاہور سے مل سکتا ہے۔

یہ تذکرہ پروفیسر محمود شیرانی نے بڑی احتیاط و اہتمام اور محنت اور صحت سے مرتب کیا ہے جس پر فاضل مرتب اور ان کے طفیل میں پنجاب یونیورسٹی قابل مبارکباد ہے۔

اس میں چھ سو تر انوے شعراء کے حالات درج ہیں اور کتاب کی ضخامت (جو بڑی تقطیع پر ہے) علاوہ دیباچہ مرتب کے آٹھ سو صفحے سے زائد ہے۔ اس تذکرے کے چھپ جانے سے اردو مطبوعات میں اور خاص کر اردو شعراء کے تذکروں میں جو اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب مولنا محمد حسین آزاد مرحوم کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جو کسی قدر کرم خوردہ اور بہت خستہ حالت میں تھا۔ دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانہ کا تھا جس کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ اس سے فاضل مرتب کی محنت اور کاوش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس تذکرے کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۲۱ھ ہے۔ اس سے قبل متعدد تذکرے

تصنیف ہو چکے تھے جن کا ذکر شیرانی صاحب نے اپنے دیباچے میں فرمایا ہے لیکن بعض تذکروں کے سنین تالیف کے متعلق کسی قدر غلطی واقع ہو گئی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی تصحیح کر دی جائے۔

تذکرہ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ بتایا گیا ہے، لیکن خود گردیزی اپنی تالیف کے آخر میں اسے سنہ ۱۱۶۶ھ کی تالیف بتاتے ہیں[1]۔ تذکرہ میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سنہ ۱۱۸۸ و سنہ ۱۱۹۲ کے مابین کی تالیف ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ میر حسن نے سودا کے ذکر میں نواب شجاع الدولہ (متوفی سنہ ۱۱۸۸) کو بقید حیات لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تذکرے کی تالیف سنہ ۱۱۸۸ سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غالباً سنہ ۱۱۹۲ کے بعد تک جاری رہی کیونکہ قصیح کے حال میں لکھا ہے کہ "دو سال یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست" اسی طرح عمدۂ منتخبہ کا سنہ تالیف ۱۲۱۶ھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ خود صاحب تذکرہ "قاسم" کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت سنہ ۱۲۱۹ھ ہے۔

ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ بیان صحیح ہے کہ "قاسم" کا تذکرہ سرور کے تذکرے (عمدۂ منتخبہ) پر مبنی ہے۔ اس کی شہادت خود سرور کے تذکرے میں موجود ہے۔ وہ قاسم کے حال میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ختم اللہ بالحسنی فی خامس محرم الحرام المنتظم فی ہمام ستہ وستین و مائتہ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ النبویۃ۔

"در ینولا کہ سنہ ۱۲۱۹ ہجریست بہ سبب مغالطہ این مجموعہ خود ہم ذوقِ تالیف نمودن تذکرہ پیدا کردہ چنانچہ از مؤلف مسودہ را گرفتہ انتخابِ اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است"

اس کا ثبوت ان دونوں تذکروں کے مطالعہ سے بھی ملتا ہے۔ متعدد شعرا کے حالات خفیف لفظی تغیر کے ساتھ بالکل وہی ہیں جو سرور کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں اور منتخب اشعار بھی اکثر وہی ہیں۔ خود قاسم نے بھی تذکرہ سرور کا دو ایک جگہ حوالہ دیا ہے۔[1] علاوہ اس کے وہ تذکرہ میر، تذکرہ مصحفی اور تذکرہ ذکا کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ لیکن قائم، میر حسن، قدرت اللہ شوق کے تذکروں کا کہیں نام نہیں لیا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد میر فتح علی الحسینی الگردیزی کے تذکرے کا مطلق ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی دوسری تصانیف میں ان کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتا ہے۔

فاضل مرتب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آبحیات کا ایک اہم ماخذ ہے"۔ اور اس لیئے اس زمانہ میں جو بعض غلطیاں یا غلط بیانیاں آزاد مرحوم سے منسوب کی گئی ہیں۔ دراصل ان کا ملزم قاسم ہے منجملہ اُن کے میر صاحب کی بد دماغی اور تنگ مزاجی کے متعلق آزاد نے نمک مرچ لگاکر ایک طومار لکھ مارا ہے جو مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے

---

[1] صفحہ ۲۰۱ و ۲۹۵ (جلد اول)

اصل فقرے قاسم کی عبارت کے لفظ بلفظ ترجمے ہیں خصوصاً ولی کی نسبت یہ فقرہ کہ "ولی شاعر یست از شیطان مشہور تر" جو سراسر میر صاحب پر اتہام ہے اسی تذکرے سے نقل کیا گیا ہے۔ میر خان کمترین کا یہ مصرع "ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"۔ کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ قاسم خود اس امر کے مقر ہیں کہ یہ (کمترین) ہر شخص کی نسبت کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتا تھا اور ایک عامی وضع شخص تھا بات یہ ہے کہ بعض اشخاص جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ اور میر صاحب سے داد کے طالب ہوتے تھے وہ انہیں منھ نہیں لگاتے تھے۔ یہ اپنے دل کا بخار اس طرح نکالتے تھے۔ غالباً قاسم کا شمار بھی اسی قسم کے شعرا میں تھا۔ چنانچہ اس کے ضخیم کلیات سے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ مشاق شاعر ہے مگر کلام لطف سے خالی ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعراء انجمن ترقی اردو نے مدت ہوئی شایع کر دیا ہے۔ وہ قلمی نسخہ جس پر مطبوعہ نسخہ مبنی ہے اب تک میرے پاس موجود ہے۔ یہ سید عبدالولی عزلت کا نسخہ ہے جو میر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نسخہ بہت صاف اور خوش خط لکھا ہوا ہے اور عزلت نے اپنے لیے نقل کروایا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ۱۱۷۲ھ (یعنے تالیف تذکرہ کے سات سال بعد) ہے۔ اس میں ولی کی نسبت صاف لکھا ہے "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"[1]۔ ایسا

---

[1] نکات الشعرا صفحہ ۹۲۔

معلوم ہوتا ہے کہ کسی بدطینت مخالف نے "مشہور تر از شیطان" کی اڑا دی، چلتا ہوا فقرہ تھا، عام و خاص میں مشہور ہو گیا۔

بعض حضرات نے جو یہ قیاس قائم کیا ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ہو اور بعد میں یہ فقرہ خارج کر دیا گیا ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ میر صاحب اس مزاج کے آدمی نہ تھے کہ وہ کسی کے کہنے سننے یا مخالفت سے اپنی رائے بدل دیتے یا اپنے تذکرے میں سے کوئی عبارت خارج کر دیتے۔ ایک شہادت اور میں اپنی تائید میں پیش کرتا ہوں شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں میر صاحب کے حق میں بہت زہر اگلا ہے اور دل کھول کر ان کی مذمت کی ہے اور نکات الشعرا میں جہاں کوئی ذرا سی بھی بات مل گئی ہے تو اس نے اس بات کا تبنگڑ بنا دیا ہے میر صاحب کا تذکرہ اس کے پیش نظر تھا۔ جا بجا اس کا ذکر ہے۔ اگر اس میں ولی کی نسبت یہ فقرہ ہوتا تو وہ کبھی درگزر نہ کرتا۔ درگزر کرنا کیا معنی ایک آفت برپا کر دیتا۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ میر صاحب پر اتہام ہے اور اس کا الزام قاسم کے سر ہے۔

پروفیسر شیرانی تحریر فرماتے ہیں "حکیم صاحب میر صاحب (میر تقی میر) سے بھی خفا ہیں خفگی کے اسباب سے ہم ناریکی میں ہیں" ناراضی کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے پیر و مرشد سید فتح علی گردیزی میر صاحب سے کسی وجہ سے ناراض تھے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے متعلق ہر اپنی رائے تذکرہ

گردیزی کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں یہ خفگی ان کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے میر صاحب کے ذکر میں صرف ایک سطر ہے اور انتخاب کلام میں صرف ایک شعر حالانکہ معمولی معمولی شعراء کے کلام سے کئی کئی شعر اور بعض بعض کے کلام سے کئی کئی صفحے نقل کیے ہیں۔ مرشد کی ناراضی سے مرید بھی ناراض ہے۔ اور جو کام مرشد سے نہ ہو سکا وہ مرید نے کر ڈالا۔

دوسرا بہتان قاسم نے میر صاحب پر یہ باندھا ہے کہ باوجودیکہ خان آرزو کے شاگرد ہیں مگر بوجہ نخوت و غرور اس سے بالکل منکر ہیں۔ اول تو میر صاحب کو خان آرزو سے تلمذ نہیں، ذکر میر میں اپنی تعلیم اور شعر گوئی کے متعلق صاف صاف لکھ دیا ہے۔ دوسرے نکات الشعراء میں جتنی تعریف خان آرزو کی ہے شاید کسی دوسرے کی کی ہو۔ ان کے علم و فضل و کمال کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں "حاصل کمالات او شاں از حیزۂ بیان بیرون است ہمہ اوستادان مضبوط فن ہیچمیرز ہیچمیرز شاگردان آں بزرگوار اند"۔ یہ باتیں آزاد کے کلام کی تقلیں، انہوں نے اپنے دلکش انداز میں اس طرح لکھا کہ عام طور پر مشہور ہو گئیں۔

بہرحال یہ تذکرہ بہت قابل قدر ہے، اس میں اکثر ایسے شعراء کا ذکر آتا ہے جن سے مؤلف بذات خود واقف تھا اور ان کے حالات جہاں تک اس کو معلوم ہو سکے بے کم و کاست لکھ دیے ہیں، اسی ضمن میں بعض پرلطف لطیفے اور حکایتیں بھی آگئی ہیں جو اس زمانے کی معاشرت، شعر گوئی، مشاعروں اور

حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سوائے دو چار کے ہر ایک کے حالات قلم بند کرنے میں انصاف اور راست بازی سے کام لیا ہے۔ ہر ایک کے کلام کی تعریف میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عام تعریف سے ان کے ذوقِ سخن کی قدر سے تھوڑی سی بدگمانی پیدا ہوتی ہے لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اور معقولیت کے ساتھ تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاق صاحب فن ہونے کے علاوہ صاحب ذوق بھی تھے۔

فاضل مرتب نے علاوہ دیباچے کے جس میں قلمی نسخوں کی کیفیت مؤلف کے حالات، تذکرے کی تنقید وغیرہ ہے کتاب کے آخر میں دو فہرستیں بھی شامل کر دی ہیں۔ ایک اسمائے اشخاص کی اور دوسری کتب و مقامات و دیگر امور کی۔ اسی کے ساتھ علیحدہ اُن اغلاط کی بھی تصحیح کر دی ہے جو مؤلف تذکرہ سے اتفاقیہ سرزد ہو گئی ہیں۔ دیباچے کے شروع میں ایسے الفاظ کی فہرست بھی (بقیہ صفحہ) دیدی ہے جو مؤلف کے زمانے میں مختلف طریقے پر لکھے جاتے تھے۔

غرض کہ قابل مرتب کی محنت و کاوش اور حسن ترتیب ہر لحاظ سے قابل داد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تذکرے کی اشاعت سے اردو زبان کی تحقیق و تاریخ میں جس کا شوق اس زمانے میں پیدا ہو چلا ہے۔ بیش بہا مدد ملے گی۔

19.2.50

باز کے سو شعر

یعنی

مولوی محمد تراب علی خان صاحب باز

کے

کلام میں سے ایک سو بہترین اشعار کا انتخاب

اس کے متعلق ملک کے مشہور شعراء نے اچھی رائیں دی ہیں اور شاعر کے ذوق سلیم اور وجد آفریں و کیف آور طبیعت کی ستائش کی ہے رسائل اور اخبارات نے بھی ہمت افزا ریویو لکھے ہیں ۔

کتاب دبیز کاغذ پر نہایت نفیس چھپی ہے مصنف کی تصویر بھی ہے ۔ پاکٹ سائز (۳۲ صفحات)

قیمت دو آنہ (۲/)

ملنے کا پتہ

"کاشانۂ باز" بازار گھانسی

حیدرآباد دکن

مطبوعہ شمس الاسلام پریس چھتہ بازار